قرآن کریم پڑھنے پڑھانے
کے متعلق تاکید

از

سیدنا حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

قرآن کریم پڑھنے پڑھانے کے متعلق تاکید

(تقریر فرمودہ ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۵ء بمقام بیت اقصیٰ قادیان)

تشہّد ،تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

میں نے پہلے بھی کئی بار بلکہ کئی بار کا لفظ بھی شاید غلط ہوگا یوں کہنا چاہئے کہ اپنے پیشروؤں کے تسلسل میں متواتر اور بار بار جماعت کو اِس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ قرآن شریف کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرے لیکن ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے جیسے انسان کی پیدائش اور موت کا ایک وقت ہوتا ہے، جیسے درختوں کے پھل لانے کا ایک وقت ہوتا ہے، جیسے سبزیاں اور ترکاریاں بونے کا ایک وقت ہوتا ہے، جیسے اُن کے کاٹنے کا ایک وقت ہوتا ہے اِسی طرح بنی نوع انسان کے اعمال بھی خاص خاص ماحول میں پیدا ہوتے، پنپتے، بڑھتے اور مکمل ہوتے ہیں۔

ہمارے ایک پُرانے بزرگ اپنے واقعات میں سے ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ کوئی مالدار شخص بہت ہی عیاش تھا اور رات دن اپنے اموال گانے بجانے اور شراب وغیرہ کے شغل میں خرچ کیا کرتا تھا۔ کوئی بزرگ تھے اُنہوں نے اُسے کئی دفعہ سمجھایا لیکن بجائے اِس کے کہ اُن کی نصیحت اس کے دل پر اثر کرتی اور بجائے اِس کے کہ وہ ان کے وعظ سے نصیحت حاصل کرتا وہ اپنی بداعمالیوں میں اور زیادہ بڑھتا چلا گیا اور بجائے اِس کے کہ وہ اس بزرگ کی خیر خواہی اور اس کے اخلاص کی قدر کرتا اُس نے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں ان کو دُکھ دینا شروع کر دیا اور طرح طرح کی تکالیف دینی شروع کر دیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ کی طرف تشریف لے گئے۔ ایک دفعہ حج کے ایام میں جب کہ لوگ ذوق وشوق سے طوافِ کعبہ کر رہے تھے اور وہ بزرگ بھی طواف کعبہ میں مشغول تھے (حج کرنے والوں نے تو وہاں کی حالت کو دیکھا ہے

جنہوں نے نہیں دیکھا وہ اِس طرح اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس طرح شمع کے گرد پروانے چکر لگاتے ہیں اِسی طرح کعبہ کے گرد ایک عجیب والہانہ رنگ میں دینِ اسلام کے شیدائی پھر رہے ہوتے ہیں۔ اُس وقت اُن کی وہ مضطربانہ حرکات انسانوں کی حرکات معلوم نہیں ہوتیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ شمع ہے اور اُس کے گرد گھومنے والے پروانے ہیں اور حج کے ایام میں تو اس کے گرد چلتے وقت راستہ ملنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ بلکہ جیسے میلوں وغیرہ کے دنوں میں ریلوے ٹکٹ گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں اِسی طرح وہاں کی حالت ہوتی ہے) اُن کو اپنے سامنے کے آدمی سے ٹھوکر لگی اُنہوں نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو وہ مغرور امیر جس کی وجہ سے اُن کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا طوافِ کعبہ کر رہا تھا اُن کو حیرت ہوئی اور اُنہوں نے اُس سے پوچھا کہ تم کہاں؟ اُس نے جواب میں کہا جہاں آپ مجھے دیکھ رہے ہیں وہیں ہوں۔ انہوں نے کہا آخر تمہاری ہدایت کا موجب کونسی چیز ہوئی؟ میں نے ہر طریقہ وعظ کا تمہاری ہدایت کے لئے اختیار کیا تھا اور ہر ذریعہ نصیحت دلانے کا میں نے استعمال کیا تھا لیکن تم پر ایک ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا اب خدا تعالیٰ نے وہ کونسی نئی بات پیدا کر دی ہے جو تمہارے لئے ہدایت کا موجب ہوئی۔ اُس نے کہا کچھ بھی نہیں آپ نے بیشک قرآن شریف بھی استعمال کیا، حدیث بھی استعمال کی، عقل بھی استعمال کی، غرض ہر ممکن طریقہ مجھے سمجھانے کے لئے استعمال کیا لیکن میرے نصیحت حاصل کرنے کا ابھی وقت نہ آیا تھا۔ مجھے قرآن شریف کی آیات بے معنی معلوم ہوتی تھیں، مجھے حدیث کا کلام بالکل فرسودہ کلام نظر آتا تھا، مجھے آپ کی عقل کی باتیں پاگل پن کی باتیں نظر آتی تھیں اور میں اپنی شرارتوں اور اپنی لغویات میں بڑھتا چلا جاتا تھا اور ان حالات میں کسی قسم کا بھی کوئی فرق نہ پڑتا تھا لیکن ایک دن میں اِسی طرح اپنی مجلسِ راگ ورنگ منانے کے لئے بیٹھا ہوا تھا اور تمام سامانِ تعیش کا موجود تھا اور میں لُطف اُٹھا رہا تھا کہ گلی میں سے نہ معلوم کون شخص گزرا۔ اتفاقاً اُس کی آواز اور میری توجہ ہم آہنگ ہوگئیں اور میرے کانوں میں ترنم سے ایک آواز آئی اور یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑے اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ ؎ کیا مومنوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی یاد کی طرف مائل ہوں؟ اُس نے کہا یہ الفاظ جو

نہ معلوم کون شخص کس طرز پر اور کس خیال میں پڑھتا چلا جاتا تھا میرے کانوں پر اِس طرح گرے جیسے بیان کیا جاتا ہے کہ قیامت کے دن اسرافیل کا صور پھونکا جائے گا۔ اِن الفاظ کا میرے کانوں میں پڑنا تھا کہ دنیا میری نگاہوں میں تاریک ہوگئی اور وہ چیزیں جن کو میں زندگی کا جزو سمجھتا تھا اب نہایت ہی بے ہنگم نظر آنے لگیں، میں اُسی وقت مجلس سے اُٹھا اور خدا تعالیٰ کے حضور توبہ کی اور اب آپ مجھے یہاں دیکھ رہے ہیں جہاں میں ہوں۔ تو جس شخص پر سارے قرآن شریف نے اثر نہ کیا جب وقت آیا تو ایک آیت نے اُس کی حالت کو بالکل بدل دیا۔ یہی وہ حکمت ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے لوگ ہدایت پانے سے محروم ہو جاتے ہیں اور بہت سے لوگ ہدایت دینے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ اُس وقت جب کہ ایک شخص کے لئے ہدایت مقدر ہوتی ہے تھک کر اس کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے دس سال مغز ماری کی ہے مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے دل پر مُہر لگی ہوئی ہے ہم اِس کا کیا کریں؟ اگر اُنہیں علمِ غیب ہوتا تو وہ یہ جانتے کہ یہ دس سال مُہروں کے دس سال تھے مگر اس سے اگلا منٹ جس وقت وہ اس کو چھوڑ کر چلے آئے وہی وقت تھا کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے اس مُہر کو توڑنے کے لئے آ رہے تھے اور ہزار ہا انسان اسی لئے ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ ہدایت کی باتیں سنتے ہیں، پڑھتے ہیں، اُن کے دل میں سچائی کو تلاش کرنے کی جستجو اور خواہش ہوتی ہے مگر ایک وقت گزر جانے کے بعد جب خدا تعالیٰ کی طرف سے اُن کے سینوں کو سچائی سے پُر کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے اور اُن کی مُہروں کو توڑنے کا وقت آتا ہے تو وہ اپنے گھروں میں بیٹھ جاتے اور کہتے ہیں ہم نے بہت غور کر لیا ہے اور بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کی ہے شاید دنیا میں ہدایت ہے ہی نہیں یا ہدایت ہمارے لئے مقدر ہی نہیں اس لئے سچے مذہب کی جستجو کی خواہش فضول ہے اور وہ عین اُس وقت اپنے پاؤں کو لَوٹا دیتے ہیں جس وقت منزلِ مقصود اُن کے قریب آ چکی ہوتی ہے۔

تو میں سمجھتا ہوں کہ شاید خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک وقت مقدر تھا کہ جب اِس تحریک کو ایسی شکل ملنی تھی جس کے ذریعے سے تمام باہر کی جماعتوں کے احمدی قرآن شریف سے واقفیت حاصل کر سکیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اِس تحریک میں نئی تبدیلیوں کا بھی اثر ہے جو قادیان کے

مرکزی نظام میں مجھے پچھلے سال سے کرنی پڑیں۔ میں نے محسوس کیا کہ صدر انجمن احمدیہ کے افسر یہ خیال کرتے ہیں کہ اُنہوں نے کبھی بھی اِس دنیا سے گزرنہیں جانا اور اُن کا خیال ہے کہ قیامت کے بوریے وہی سمیٹیں گے اور اُن کے قائم مقاموں کی جماعت کو کوئی ضرورت نہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ بڑھاپے کے آثار اُن میں پیدا ہو رہے ہیں، جب میں نے دیکھا کہ اُن کی قوتیں مضمحل ہو رہی ہیں اور جب میں نے دیکھا کہ وہ بات کو جلدی سے فوری طور پر سمجھنے کی قابلیتیں کھو رہے ہیں اور عنقریب ایسا خلا پیدا ہونے والا ہے جس کا پُر کرنا ہمارے اختیار سے باہر ہو جائے گا تو مَیں نے خود اپنے اختیار سے باہر کا نوجوان عنصر اُن میں شامل کر دیا اور واقفین میں سے بھی کچھ نوجوان فارغ کر کے نائب ناظر اور معاون ناظر کر کے اُن کے ساتھ لگانے شروع کر دیئے جس کی وجہ سے نظارتوں کے کاموں میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوگئی ہے۔ مثلاً اِس سال جو خطبہ جمعہ میں نے مولانا آزاد کے متعلق پڑھا تھا اُس کے متعلق میں نے دیکھا کہ وہ کام جو سابق نظارت میں شاید مہینوں تک بھی نہ ہوتا اور کچھ عرصہ کے بعد کہہ دیا جاتا اِس کا خیال تو آیا تھا مگر کچھ مشکلات پیش آ گئیں، اِن نوجوانوں نے مل کر میری تقریر اُسی وقت صاف کروا لی اور اِس کا انگریزی ترجمہ بھی کر دیا اور اُسی رات چھپوا کر دوسرے دن صبح ہی تمام ہندوستان میں پھیلا دیا۔ اور ایک آدمی کے ذریعہ کچھ خطبات شملہ بھی بھیج دیئے۔ یہ تبدیلی اس نوجوان خون کی وجہ سے ہوئی ہے جس کا انجمن کی بوڑھی رگوں میں داخل کرنے کا مجھے خدا تعالیٰ نے موقع دیا۔

یہ تحریک بھی میں سمجھتا ہوں کہ اِس تبدیلی کی ممنونِ احسان ہے۔ نیا خون انسان کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ خدا تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ انسان پہلے بوڑھا ہوتا ہے۔ پھر اپنی طاقتیں کھوتا ہے اور پھر عمرِ طبعی کو پہنچ کر مر جاتا ہے اور اگر وقتاً فوقتاً نیا عنصر اُس میں داخل کیا جائے تو وہ سلسلہ قائم رہتا ہے ورنہ نہیں۔ بہرحال مجھے خوشی ہے گو خوشی ابھی مکمل نہیں ہوسکتی کیونکہ لاکھوں کی جماعت میں سے صرف ۷۰، ۸۰ آدمیوں کا قرآن شریف کا ترجمہ پڑھنے کے لئے آنا یہ ایک چھوٹا سا بیج تو کہلا سکتا ہے لیکن ایسا درخت نہیں کہلا سکتا جس کے سایہ کے نیچے لاکھوں انسان آرام کر سکیں۔ مگر بہرحال بیجوں سے ہی روئیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور روئیدگیوں سے ہی تنے

بن جایا کرتے ہیں اور اِن تنوں سے ہی شاخیں نکلتی ہیں اور شاخیں ہی پتے پیدا کیا کرتی ہیں اور اس طرح وہ ایک بڑا درخت بن جاتا ہے جس کے سائے کے نیچے سینکڑوں بلکہ ہزاروں انسان آرام پاتے ہیں۔ اسی طرح یہ ۷۰، ۸۰ یہ تو نہیں کہتا کہ نوجوان کیونکہ اِن میں سے بعض عمر کے لحاظ سے بوڑھے بھی ہیں لیکن یہ روحانی نوجوان جو اِس جگہ پڑھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں اگر ہم ان کو بیج کے طور پر تصور کر لیں اور سمجھیں کہ یہ اپنے اپنے وطن جا کر حقیقی بیج ثابت ہونگے (بیج کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس کے اندر بڑھنے بڑھانے، پھلنے اور پھولنے کی طاقت پائی جاتی ہو) تو یہ لوگ سلسلہ کے لئے نہایت ہی مفید وجود ثابت ہو سکتے ہیں اور اسلام کی کھیتی کے لئے کھاد ثابت ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے قرآن شریف ہی دین کی جان ہے اِس کو پڑھے پڑھائے بغیر کسی قسم کی ترقی کا خیال کر لینا ایک غلط خیال ہے۔ حضرت خلیفہ اوّل عام طور پر عورتوں کے درس میں ایک چھوٹی سی مثال سنایا کرتے تھے۔ وہ ایک نہایت ہی لطیف بات ہے اگر ہم چاہیں تو اس سے بہت بڑا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو! جب میں کہتا ہوں قرآن شریف پڑھو یا سنو تو تم یہ جواب دیا کرتی ہو کہ ہم پڑھی ہوئی نہیں حالانکہ اگر کسی عورت کا بچہ باہر گیا ہوا ہو اور اُس کے نام کا کارڈ باہر سے آئے تو جو پڑھی ہوئی ہوتی ہیں وہ تو اُس کو ایک دفعہ پڑھ کر سرہانے کے نیچے رکھ دیتی ہیں یا ٹرنک میں رکھ لیتی ہیں یا کسی طاق میں رکھ دیتی ہیں مگر جو اَن پڑھ ہوتی ہیں اُن کو ایک دفعہ خط پڑھوا کر سننے سے تسلی نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی دوسرے کے پاس جاتی ہیں اور پھر اُس سے سنتی ہیں۔ مثلاً جب ایک اَن پڑھ عورت کے پاس خط آتا ہے تو پہلے وہ گاؤں کے مُلّا کے پاس جاتی ہے اور کہتی ہے مُلّا جی! ذرا کارڈ پڑھنا میرے بیٹے کی طرف سے آیا ہے۔ اُس سے سنتی ہے اور سمجھتی ہے کہ شاید کوئی لفظ مُلّا جی کی نگاہ سے رہ گیا ہو یا شاید جلدی میں سارا مضمون نہ سنایا ہو، پھر وہ دَوڑی دَوڑی چوہدری جی کی بیٹھک میں جاتی ہے اور کہتی ہے چوہدری جی! ذرا یہ کارڈ تو سنا دینا میرے بیٹے کی طرف سے آیا ہے۔ اُس سے خط سنتی ہے مگر پھر بھی تسلی نہیں ہوتی اور وہ پٹواری جی کے پاس چلی جاتی ہے اور کہتی ہے پٹواری جی! ذرا یہ خط تو سنا دینا میرے بیٹے کی طرف سے آیا ہے اُس سے سنتی ہے۔ پھر وہ مدرّس کے پاس

چلی جاتی ہے اور کہتی ہے منشی جی! ذرا اِس خط کو تو سنا دینا پھر بھی تسلی نہیں ہوتی تو ڈاکخانے والے بابو کے پاس چلی جاتی ہے اور کہتی ہے۔ ڈاکٹر بابو جی! ذرا اِس خط کو تو سنا دینا (گاؤں والے بیچارے ڈاکخانے کو کم علمی کی وجہ سے ڈاکٹر خانہ کہتے ہیں) وہ اُس کے پاس جاتی ہے اور کہتی ہے ڈاکٹر بابو جی! ذرا یہ خط تو سنا دینا اور اِس طرح جب تک اُسے سات آٹھ دفعہ سن نہیں لیتی اُسے تسلی نہیں ہوتی اور کارڈ کو اپنے قریب ہی رکھتی ہے۔ ایک دو ماہ کے بعد اگر کوئی باہر کا آدمی اس گاؤں میں آ جائے اور اُس کو اِس کا علم ہو جائے کہ وہ پڑھا ہوا ہے تو وہ اُس کے پاس چلی جاتی ہے اور کہتی ہے ذرا یہ خط تو سنا دیں۔ غرض پڑھی لکھی عورتیں تو ایک دفعہ پڑھ کر چپ کر جاتی ہیں مگر اَن پڑھ عورتوں کو تم دیکھتی ہو کہ جب تک سات آٹھ دفعہ خط پڑھوا نہ لیں آرام نہیں لیتیں۔

پس خدا تعالیٰ تمہارا یہ عُذر ہرگز نہیں سنے گا کہ ہم پڑھی ہوئی نہیں ہیں خدا تعالیٰ پوچھے گا کہ تم نے اپنے بیٹے کا کارڈ اتنی دفعہ پڑھوالیا تھا تو تم نے میرا کارڈ کیوں نہ پڑھوایا۔ اگر تمہیں مجھ سے اتنی بھی محبت ہوتی جتنی اپنے بیٹے سے تھی تو تم میرا خط بھی پڑھوا کر سنا کرتیں مگر تم نے میرا خط بند کر کے رکھ دیا اور کسی سے نہ سنا اور اپنے بیٹے کا کارڈ پڑھواتی پھریں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ جس چیز پر انسان کی زندگی کا مدار ہے اور جس کے بغیر انسان انسان نہیں کہلا سکتا اس کے متعلق اس قسم کے عُذر تراشنا کہ ہم پڑھے ہوئے نہیں جاہل ہیں بالکل غلط بات ہے۔

دنیا میں ہر چیز پڑھی تو نہیں جاتی بہت سی چیزیں سننے سے آتی ہیں۔ کیا دنیا کے ہر شخص نے کابل دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے طہران دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے بغداد دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے قاہرہ دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے دمشق دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے قسطنطنیہ دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے ٹوکیو(TOKYO) دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے برلن(BERLIN) دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے پیرس(PARIS) دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے میڈرڈ(MEDRID) دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے لندن (LONDON) دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے پیٹس برگ (PETSBURG) دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے ماسکو(MOSCOW) دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے نیویارک(NEW YORK) دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے ہانگ کانگ

(HONG KONG) دیکھا ہے؟ کیا ہر شخص نے شنگھائی دیکھا ہے؟ ہم نے کتنی چیزیں دیکھی ہیں اور کتنی سُنی ہیں؟ اگر مقابلہ کیا جائے تو سننے کی چیزیں ہزار ہا گُنا زیادہ ہیں اور دیکھنے والی چیزیں ہزار ہا گُنا کم ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دیکھی ہوئی چیزیں اکثر نظر انداز ہو جاتی ہیں اور سنی ہوئی چیزیں اکثر یاد رہتی ہیں۔ ہم روزانہ سیر کے لئے باہر جاتے ہیں اور میدانوں اور پہاڑوں اور جنگلوں میں سے گزرتے ہیں لیکن جب باہر سے آنے والے انسان سے پوچھو کہ تم نے سیر میں کیا کیا دیکھا؟ اُس نے کئی کروڑ چیزیں دیکھی ہوتی ہیں مگر جب پوچھیں تو زیادہ سے زیادہ یوں کہہ دے گا بڑا اچھا نظارہ تھا۔ جب پوچھیں بتاؤ تو سہی کیا نظارہ تھا؟ تو آگے سے یہ جواب دے دیتے ہیں کہ بڑا اچھا نظارہ تھا، دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ دراصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ یاد کچھ نہیں اور ہمارا یہ فقرہ کہنا کہ وہ نظارے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں اپنے اندر درحقیقت یہ مفہوم رکھتا ہے کہ خاص نگاہ سے کسی چیز کو دیکھا ہی نہیں ویسے نظارے اچھے لگے۔ لیکن اِس کے مقابل پر اگر یہ پوچھا جائے کہ راستہ میں کون کون ملا اور کس کس سے کیا کیا باتیں کیں؟ تو وہ اس سے بیسیوں گُنے زیادہ باتیں بتا دے گا۔ وہ یہ بتلائے گا کہ راستے میں فلاں چوہدری ملا اُس نے یہ کہا، فلاں ملا اُس نے یہ کہا اور فلاں آدمی جو مجھے ملا اُس نے یہ کہا تو جو سُنی ہوئی باتیں ہیں وہ قریباً ساری یاد ہونگی اور دیکھی ہوئی باتوں میں سے اکثر بھول گئی ہونگی۔

بات یہ ہے کہ حافظے سے تعلق رکھنے والی دیکھنے اور سننے کی الگ الگ حسیں ہیں اور تجربہ بتاتا ہے کہ سننے والی چیزیں زیادہ یاد رہتی ہیں اور دیکھنے والی چیزیں کم یاد رہتی ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جتنا بھی ہم کسی چیز کو زیادہ قریب کرتے ہیں اُتنا ہی وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے۔ ہر وقت ماں کی گود میں رہنے والا بچہ ماں کو اتنا یاد نہیں ہوتا جتنا دُور کا رہنے والا۔ وہ اپنے ایک بچہ کو گود میں اُٹھائے ہوئے ہوتی ہے لیکن اُس کا دماغ اُس بچہ کی طرف نہیں ہوتا بلکہ اُس بچہ کی طرف ہوتا ہے جو دور ہوتا ہے۔ اِسی طرح وہ چیزیں جن میں سے انسان ہر وقت گزرتا ہے وہ اتنا اثر اُس کی طبیعت پر نہیں ڈالتیں جتنا وہ چیزیں جن میں سے انسان کبھی کبھی گزرتا ہے اثر ڈالتی ہیں۔ آنکھیں ہر وقت دیکھتی ہیں مگر کان ہر وقت نہیں سنتے، شور وغل تو ہر وقت ہوتا رہتا ہے مگر اُس کی طرف انسان کی توجہ نہیں ہوتی صرف ایک گونج سی ہوتی ہے جو کان سنتے ہیں مگر وہ

چیز توجہ کھینچنے والی نہیں ہوتی۔ جس طرح میں تقریر کر رہا ہوں اور میری تقریر تمہاری توجہ کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے تو جو معیّن سننا ہے وہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔ لیکن جب تک انسان جاگتا رہتا ہے آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور کوئی نہ کوئی چیز ہر وقت آنکھ دیکھتی رہتی ہے جس کی وجہ سے آنکھ فوراً اثر اخذ نہیں کرتی۔ لیکن کان کبھی کبھی سنتے ہیں اس لئے کان اس کو اخذ کرنے کے لئے اور دماغ اس کو حاصل کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اِسے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ آپ کا ایک بڑا گہرا دوست آپ کو ملنے کیلئے آتا ہے اور اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتا ہے آپ وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ کہہ کر اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور آپ کو اس کا خیال نہیں رہتا۔ کچھ دیر کے بعد آپ کہتے ہیں اوہ! مجھے خیال نہیں رہا تھا آپ سے بات کرنے کا۔ لیکن ایک اجنبی آدمی آتا ہے تو آپ اُس سے اِس طرح نہیں کرتے جس طرح اپنے دوست کے ساتھ کیا تھا بلکہ آپ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں اور اُسے تپاک سے ملتے ہیں اور پوچھتے ہیں آپ کہاں سے آئے؟ کیسے آئے؟ اس طرح دس بیس باتیں کرتے ہیں اور پھر اُسے تپاک سے رُخصت کرتے ہیں تو نئے آنے والے کی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہماری جماعت کے کئی افراد جو زیادہ سمجھدار نہیں ہوتے وہ اِس پر بگڑ جاتے ہیں کہ غیر کی خاطر کی اور ہماری نہیں کی وہ جانتے نہیں کہ یہ فطرتی اور طبعی امر ہے کہ انسان نئی چیز کی طرف توجہ کرتا ہے اور اسے ایسا کرنا چاہئے۔

حضرت مسیح ناصری کی ایک مثال کیسی لطیف ہے۔ آپ نے فرمایا کوئی شخص تھا اُس نے اپنے اموال دو بیٹوں میں تقسیم کر دیئے اور کہا بیٹو! جاؤ کماؤ اور کھاؤ! اُن میں سے ایک نے کہا باپ سے مال ملا ہے مُفت کا ہے اِس لئے آؤ خوب گل چھرے اُڑائیں۔ اُس نے عیاشی شروع کر دی اور خوب مال اُڑایا۔ دوسرے نے کہا میرے باپ کا مال ہے اِس کی حفاظت کرنی چاہئے۔ اُس نے روپیہ کمانا اور جمع کرنا شروع کر دیا۔ حسبِ ضرورت کچھ گزارے کے لئے خرچ کرتا رہا اور باقی رقم جمع کرتا گیا آخر بہت سا روپیہ لے کر گھر واپس آیا۔ باپ نے اُس کی بڑی تعریف کی اور عزت سے گھر میں بٹھایا اور اپنے دوسرے بیٹے کا انتظار کرتا رہا مگر دوسرا بیٹا سارا مال کھا چکا تھا وہ کونسا منہ لے کر باپ کے پاس جاتا، وہ باپ کے پاس جانے کا خیال چھوڑ کر دُور نکل گیا اور کسی شخص کے ہاں سؤر کا گلہ چرانے پر نوکر ہو گیا، روزانہ چھوٹے چھوٹے

بچے جو چل نہ سکتے تھے اُن کو کمر پر لادتا اور باقی بچوں کی گردنوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے ریوڑ کو ہانک کر باہر لے جاتا اور لاتا تھا۔ اُس کا مالک بعض اوقات کسی وجہ سے اُسے گالیاں دیتا اور مارنے کے لئے بھی تیار ہو جاتا اور کہتا نالائق! تم نے یہ کام نہیں کیا وہ کام نہیں کیا، وہ اس سے بہت تنگ آ گیا اور ایک دن غصے میں آ کر اُس نے سؤر کے بچے کو زور سے زمین پر پٹخ دیا اور کہا میرے باپ کے گھر میں صرف بھائی ہی تو نہیں کئی نوکر بھی ہیں اگر نوکری ہی کرنی ہے تو کیوں نہ میں باپ کے پاس چلا جاؤں اور اُس کی نوکری کر لوں، وہ لَوٹ کر اپنے باپ کی طرف آیا۔ جب باپ کو پتہ لگا کہ میرا بیٹا واپس آ رہا ہے تو اُس نے اپنے تمام دوستوں کو جمع کیا اور اُس کے استقبال کے واسطے گیا اور اپنے گھر میں لے آیا۔ اُس نے اِس خوشی میں کئی دنبے ذبح کئے اور لوگوں کو بُلا کر اُن کی دعوت کی۔ دوسرا بیٹا جو کما کے لایا تھا اُس کو بہت غصہ چڑھا اور اُس نے اپنے باپ سے کہا اے باپ! تیری بھی عجیب عقل ہے میں نے تیرے مال کو حفاظت سے رکھا، کمایا، اُس کو بڑھایا اور پھر واپس لے کر تیرے گھر آیا لیکن تو نے میرے آنے پر ایک کمزور دُنبی بھی ذبح نہیں کی لیکن یہ جس نے تیرے مال کو ضائع کیا اور اس کو تلف کر دیا اور عیاشی میں اپنی عمر گزاری یہ آیا تو تو نے اِس کا استقبال کیا اور کئی دُنبے ذبح کر ڈالے۔ باپ نے کہا اے میرے بیٹے! تو میرے پاس تھا جو چیز پاس ہوتی ہے اُس کی انسان خوشی نہیں کیا کرتے لیکن جو چیز گم ہو جاتی ہے اور پھر ملتی ہے اُس کی خوشی کیا کرتے ہیں۔ یہ گم ہوا تھا مجھے واپس ملا اِس لئے میں نے خوشی کی۔[۲] پھر حضرت مسیحؑ نے فرمایا۔ ایسا ہی خدا کو اُس شخص کے واپس آنے سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جو گنہگار ہوتا ہے اور توبہ کر کے اُس کے حضور میں حاضر ہو جاتا ہے۔

اِس مثال میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو چیز ہر وقت پاس موجود رہتی ہے اس کی وجہ سے طبیعت میں کوئی خاص تغیر پیدا نہیں ہوتا اور اس کی طرف خاص طور پر توجہ نہیں ہوتی لیکن جو گم جائے یعنی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے چونکہ اس کا گم ہو جانا ہر وقت دل میں ٹیس پیدا کرتا ہے اس لئے جب بھی وہ زخم مندمل ہو تو قدرتاً خوشی ہوتی ہے۔ تو جو چیزیں کبھی کبھی سامنے آئیں اُن کی طرف توجہ زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ حِسیں جو کبھی کبھی کام کرتی ہیں وہ گہرا اثر چھوڑ جاتی ہیں بہ نسبت اُن حِسوں کے جو ہر وقت کام کرتی ہیں۔

ایک اور موٹی مثال دیکھو! زندگی میں ہم کتنی چیزوں کو دیکھتے ہیں جن کا مادی زندگی سے تعلق ہوتا ہے، مادی زندگی کے لحاظ سے ہمارے جاگنے کی حالت حقیقی ہے اور رؤیا کی حالت غیر حقیقی ہے۔ اور اگلے جہان کے لحاظ سے رؤیا کی حالت حقیقی ہے اور مادی زندگی کی غیر حقیقی۔ پس جہاں تک اِس جہاں کا تعلق ہے ہماری رؤیا کی حالت غیر حقیقی ہے اور جاگنے کی حالت حقیقی ہے اب اپنی عمر میں تم اندازہ لگا کر دیکھو کہ عام طور پر آدمی اپنی عمر میں چند رؤیا دیکھتا ہے اور اس کے مقابل پر اربوں ارب نظارے جاگنے کی حالت میں دیکھتا ہے لیکن ان میں سے اکثر بھول جاتے ہیں لیکن جو خواب کے نظارے ہوتے ہیں ان میں سے بعض پر بعض اوقات چالیس پچاس سال گزر جاتے ہیں لیکن وہ نہیں بھولتے۔ کوئی شخص خواب دیکھتا ہے وہ کہتا ہے میں نے ایک بڑا خوشنما درخت چالیس سال ہوئے دیکھا اور اس کے مقابل پر جاگتے ہوئے وہ روزانہ جو بڑے بڑے خوشنما درخت دیکھتا ہے وہ یاد نہیں رہتے کیونکہ مادی آنکھوں کے نظارے وہ روزانہ کرتا ہے اور خواب کی آنکھ سے کبھی کبھی نظارہ دیکھتا ہے یہی فرق دیکھنے اور سننے کی حِس کا ہے۔ انسان کی دیکھنے کی حِس ہر وقت کام کرتی ہے اور سُننے کی حِس اِس سے کم کام کرتی ہے اس لئے سننے کی حِس کا قوتِ حافظہ پر زیادہ اثر پڑتا ہے بہ نسبت دیکھنے والی حِس کے۔ پھر بعض دفعہ دو دو، تین تین حِسیں مل کر ایک کیفیت کو محسوس کرتی ہیں وہ حافظہ پر اور بھی گہرا اثر ڈالتی ہیں اسی لئے اگر ایک حِس سے کوئی ثواب کا کام کیا جائے اور اس کے ساتھ دوسری ایک دو اور حِسوں کو بھی ملا لیا جائے تو زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مسلمان بزرگ باوجود اِس کے کہ اُن کو قرآن شریف حفظ ہوتا تھا وہ قرآن شریف کو کھول کر اُسے آنکھوں سے دیکھتے تھے، زبان سے پڑھتے تھے اور ساتھ ساتھ اُنگلی چلاتے جاتے تھے۔ کسی ایسے ہی بزرگ سے جب کسی نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے جب آپ کو قرآن شریف حفظ ہے تو پھر قرآن شریف دیکھ کر کیوں پڑھتے ہیں اور اگر قرآن شریف دیکھ کر پڑھتے ہی ہیں تو ساتھ ساتھ منہ سے کیوں دُہراتے جاتے ہیں اور پھر اِس کے ساتھ اُنگلی ہلاتے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے جواباً کہا کہ میاں! خدا تعالیٰ کے سامنے ہر چیز کا جائزہ ہوگا اگر میں نے حافظہ کے ذریعہ پڑھا تو صرف دماغ عبادت گزار ہوگا جب خدا تعالیٰ نے مجھے آنکھیں دی ہیں تو یہ

عبادت گزار کیوں نہ ہوں اور زبان دی ہے تو وہ عبادت گزار کیوں نہ ہو اِس لئے قرآن شریف دیکھ کر پڑھتا ہوں اور زبان سے دُہراتا جاتا ہوں اور ساتھ ساتھ اُنگلی بھی رکھتا چلا جاتا ہوں تا کہ اُنگلی بھی عبادت گزار ہو جائے۔ تو جتنی حِسیں زیادہ کام کرتی چلی جاتی ہیں ثواب بھی بڑھتا چلا جاتا ہے اِسی طرح حافظے میں جتنی زیادہ حِسیں لگائیں گے اتنی ہی زیادہ بات یاد رہے گی۔ جس کام میں کان، آنکھ اور قوتِ لامسہ تینوں لگ جائیں وہ زیادہ دیر تک حافظہ میں قائم رہے گی تو جن چیزوں کو انسان کبھی کبھار استعمال کرتا ہے وہی حافظہ میں زیادہ قابلِ قدر سمجھی جاتی ہیں کیونکہ کبھی کبھار آنے والے انسان کی طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے۔

دماغ میں ایک بڑی لائبریری بنی ہوئی ہے جس طرح دنیا میں لائبریریاں ہیں۔ دنیا کی لائبریریاں چھوٹی ہیں لیکن دماغ میں اتنی بڑی لائبریری ہے کہ اربوں ارب کوٹھڑیاں اِس میں ہیں ہر چیز جسے انسان دیکھتا ہے یا جسے انسان سنتا ہے اُسی وقت حافظہ کے نگران اُس چیز کو جسے وہ دیکھتا ہے یا سنتا ہے یا چھوتا ہے یا چکھتا ہے یا سونگھتا ہے فوراً ہر الگ الگ چیز کو الگ الگ کوٹھڑیوں میں رکھ دیتے ہیں۔ غرض ہر بات کے لئے ایک الگ کوٹھڑی موجود ہے فوراً اُسے وہاں رکھ دیا جاتا ہے اور ہر ادنیٰ حرکت جو ہم کرتے ہیں وہاں محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر جب ہمیں کسی وقت کوئی خیال آتا ہے مثلاً ہم نے زید کو دیکھا اُس کو دیکھتے ہی دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فلاں کا بیٹا ہے یہ تو ہمارا پُرانا واقف ہے، ہمارے محلے کا رہنے والا ہے اور ہمیں فلاں جگہ ملا تھا۔ پہلے اس کو ان باتوں کا بالکل خیال نہیں ہوتا لیکن جس طرح ایک افسر جب دفتر میں آتا ہے اور اس کے سامنے مسل پیش ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے اس کے متعلق پہلے کاغذات پیش کرو اسی طرح جب زید سامنے آتا ہے تو جو دماغ کے لائبریرین ہیں اُن کو فوراً حکم دے دیا جاتا ہے کہ اس کی مسل مکمل کر کے پیش کرو۔ اِس پر وہ اس کی مسل مکمل کرتے ہیں وہ مختلف خانوں سے جو جو باتیں اس سے متعلق ہوتی ہیں انہیں اکٹھا کرتے ہیں اور اس کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور وہ اُسے ملتے ہی کہتا ہے آپ میرے رشتہ دار ہیں مجھے فلاں جگہ ملے تھے، آپ کا گھر فلاں جگہ ہے، آپ ہماری بیوی کے فلاں رشتہ دار ہیں، آپ کی والدہ ہماری خالہ لگتی ہیں وغیرہ وغیرہ حالانکہ زید کو دیکھنے سے پہلے یہ خیالات اُس کے ذہن میں نہ تھے مگر سامنے آتے ہی

ساری کی ساری مسل مکمل ہو کر پیش ہو جاتی ہے۔ تو جتنے زیادہ حواس کسی چیز کے محسوس کرنے میں استعمال ہوتے ہیں اُتنی ہی زیادہ وہ حافظہ میں قائم رہتی ہے کیونکہ اُسے لائبریری کی کئی الماریوں میں رکھا جاتا ہے اور لائبریرین کا اسے نکالنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اگر ایک الماری اُس کے ذہن سے نکل گئی ہو تو دوسری الماری اُسے اس کے وجود کا پتہ دے دیتی ہے۔

غرض خدا تعالیٰ نے حافظہ کے متعلق ایک بڑا لطیف اور وسیع قانون بنایا ہے اور اس قانون سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں سُنی ہوئی باتیں ہمیں زیادہ یاد رہتی ہیں بہ نسبت دیکھی ہوئی باتوں کے۔ (جس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ سُنی ہوئی بات اپنی اصلی شکل میں قائم رہتی ہے اور دیکھی ہوئی چیز بدلتی رہتی ہے جیسے انسانوں کی شکلیں، مکانات، سڑکوں وغیرہ کی حالت) میری تقریر کو ہی لے لو اِس کا سننا زیادہ اہم ہے پڑھنے سے۔ کیونکہ زیادہ آدمی سننے والے ہیں اور پڑھنے والے تھوڑے ہیں، پڑھنے والے اگر بعد میں پڑھ لیں تو پڑھ سکتے ہیں لیکن اکثر حصہ تعلیم یافتہ نہیں ہے اس لئے ہمیں پڑھے ہوؤں کی اتنی فکر نہیں جتنی اَن پڑھوں کی۔ ہمارے ملک میں چھ فیصدی آدمی پڑھے ہوئے ہیں اور ۹۴ فیصد آدمی اَن پڑھ ہیں۔ ہمیں چھ فیصدی پڑھے ہوؤں کی اتنی فکر نہیں ہونی چاہئے جتنی ۹۴ فیصدی اَن پڑھوں کی۔ یہ سیدھی اور صاف بات ہے کہ اگر کسی قوم کے ۹۴ فیصدی افراد خراب ہوں گے تو چھ فیصدی اس سے بچ نہیں سکتے۔ لکڑی تیرتی ہے اور پتھر ڈوبتا ہے لیکن اگر بڑی لکڑی پر ایک چھوٹے سے پتھر کو رکھ دیں تو وہ بھی تیرتا ہے اور اگر چھوٹی سی لکڑی پر ایک بڑی سِل رکھ دیں تو لکڑی بھی ساتھ ہی ڈوب جائے گی تو کثرت، قلّت کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ پس اگر چھ فیصدی آدمی قرآن شریف پڑھ لیں اور اُسے اچھی طرح جان لیں اور ۹۴ فیصدی آدمی قرآن شریف نہ جانتے ہوں تو روحانی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک سَو فیصدی آدمی قرآن شریف نہ پڑھ لیں، اُسے سمجھ نہ لیں، اُسے اچھی طرح جان نہ لیں ہم محفوظ نہیں ہو سکتے اس لئے ضروری ہے کہ باقی ۹۴ فیصدی کو بھی ہم پڑھائیں، ان کی سُستیوں کو دور کریں اور بار بار کہہ کر اُن کو مجبور کر دیں کہ وہ قرآن شریف کو سُنیں اور یاد کریں اور ان کی توجہ اِس طرف پھیر دیں کہ اُن کے لئے قرآن شریف کا سننا اور یاد کرنا ضروری ہے۔

اس کام کو پورا کرنے کے لئے میں نے اس تحریک کوشروع کیا ہے اور اِس دفعہ سَتر اَسّی آدمی آئے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ۷۰، ۸۰ آدمی کافی ہیں ہاں وہ ۷۰، ۸۰ آدمی بنیاد کا کام تو دے سکتے ہیں مگر ہمارے لئے مکمل عمارت کا کام نہیں دے سکتے۔ لاکھوں کی جماعت میں سے ۷۰، ۸۰ آدمیوں کا تیار ہو جانا کوئی حیثیت نہیں رکھتا اِس کی تو اتنی بھی حیثیت نہیں جتنی آٹے میں نمک کی۔ یہ تو اُسی وقت ہمارے کام آ سکتے ہیں جب یہ اپنی جماعتوں میں جا کر جو کچھ اِنہوں نے پڑھا ہے اُسے اُن لوگوں کو پڑھائیں جو پڑھ سکتے ہیں اور باقیوں کو سننے اور یاد کرنے پر مجبور کریں اور اتنا سنائیں کہ اُن کو یاد ہو جائے اور اِس طرح اُن کو یاد کرائیں کہ ہماری جماعت کے تمام افراد کو قرآن شریف کا علم حاصل ہو جائے۔ آخر ہمیں سوچنا چاہئے کہ کیا وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صحبت میں رہتے ہوئے تیرہ یا پندرہ سال کے اندر اندر ایسی جماعت تیار ہوگئی جو ساری دنیا کی معلّم ثابت ہوئی لیکن ہم پر پچاس سال گزر گئے ہیں ابھی تک ہم میں وہ تغیر نہیں پیدا ہوا اور نہ ہم سے وہ تغیر پیدا ہوا ہے۔ اگرچہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کا علم حاصل کرنے کے لئے انہیں ایک سہولت حاصل تھی کہ جو باتیں اُن کے سامنے کی جاتی تھیں وہ اُن کی اپنی زبان میں ہوتی تھیں اس لئے ہر بات سُنتے ہوئے اسے ساتھ ساتھ سمجھتے بھی جاتے تھے ان کے لئے اتنا کافی تھا کہ اگر کوئی انسان ان کے کان میں صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ تو اُن کی زندگی کے لئے کافی تھا اسلئے کہ ان میں سے ہر ایک جانتا تھا کہ ال کے کیا معنی ہیں، وہ جانتا تھا کہ حمد کے کیا معنی ہیں، وہ جانتا تھا کہ دال کے اوپر جو پیش ہے اُس کے کیا معنی ہیں، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اللّٰہِ جس کے آخر میں ہ ہے اور جس کی ہ کے نیچے زیر ہے اِس کے کیا معنی ہیں، وہ جانتا تھا الرَّحْمٰن میں ال کیا کہتا ہے اور رحمٰن کیا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ الرَّحِیْمِ کا ال کیا کہتا ہے اور رحیم کیا کہتا ہے، اور الرَّحِیْمِ کے نیچے جو زیر ہے وہ کیا کہتی ہے، وہ یہ سب کچھ جانتا تھا اِس لئے اس کیلئے اَلْحَمْدُ کے الفاظ کا سننا ہی کافی ہو جاتا تھا مگر ہمارے ملک کے لوگ جو عربی زبان سے بکلّی ناواقف ہیں ان سے بِسْمِ اللّٰہِ کی ب سے لیکر وَالنَّاسِ کی س تک قرآن سُن جاؤ اگر انہوں نے ناظرہ پڑھا ہوا ہے یا قرآن حفظ کیا ہوا ہے تو وہ سب کچھ سنا دیں گے لیکن یہ نہ جانتے ہوں گے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ سمجھتے کچھ بھی نہیں

بلکہ جو کچھ یاد ہے یا جو لفظ پڑھے ہوئے ہیں انہیں دُہراتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب والوں میں صرف سورہ فاتحہ جو تغیر پیدا کرسکتی تھی ہماری جماعت میں سارا قرآن وہ تغیر پیدا نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ اِس جماعت کے اکثر افراد قرآن کریم کے معنی نہیں جانتے۔ اب اِس کا علاج دو ہی طرح ہوسکتا ہے کہ یا تو ہم ان کو قرآن تک لے جائیں یعنی اُن کو عربی پڑھا دیں تا وہ قرآن کو سمجھ سکیں اور اگر یہ نہیں تو قرآن کو اُن تک لے جائیں یعنی اِس کا ترجمہ اُن کو سنائیں۔ ان عربی دانوں کے بغیر ہم قومی تغیر پیدا نہیں کر سکتے اور نہ ہی کوئی روحانی عظیم الشان تغیر کر سکتے ہیں۔ ہمارے اندر جو کوتاہیاں، سُستیاں اور غفلتیں پائی جاتی ہیں اِن کی ایک ہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہم پر قرآن شریف کے دروازے نہیں کُھلے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب اسلام باہر کے ممالک میں پھیلا اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے تو اُن کے لئے یہی مشکل پیش آئی کہ وہ نمازیں کس طرح پڑھیں، قرآن کس طرح پڑھیں جبکہ اُن کو عربی ہی نہیں آتی۔ اِس حالت کو دیکھ کر حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فتویٰ دے دیا کہ گو نماز کو اصل صورت میں پڑھنا زیادہ ثواب کا موجب ہے لیکن جو قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے اور نماز بھی عربی میں نہیں پڑھ سکتے وہ قرآن کا ترجمہ پڑھ لیا کریں اور یہ بھی جائز ہے کہ نماز کا بھی اپنی زبان میں ترجمہ کرلیں اور اسے یاد کرلیں اور نماز دل میں پڑھا کریں۔ غرض ایک تو وہ لوگ تھے کہ وہ جب اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پڑھتے تھے تو جانتے تھے کہ اِس کے کیا معنی ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے کیا معنی ہیں لیکن ایک آجکل کے لوگ ہیں جو مسلمان تو ہیں لیکن قرآن شریف کو نہیں جانتے اسلام سے محض ناواقف ہیں۔ ان دونوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص وہ ہے جو ٹرنک کھولتا ہے اور اُس میں سے کپڑے نکال کر دیکھتا ہے کہ یہ پاجامہ ہے، یہ قمیض ہے، یہ کوٹ ہے، یہ پگڑی ہے اور ایک اور انسان ہے وہ ایک ٹرنک جس کو تالا لگا ہوا ہے اُس پر ہاتھ پھیر لیتا ہے کیا اِن دونوں میں کوئی نسبت ہوسکتی ہے؟ جس شخص کو قرآن شریف کے معنی نہیں آتے اُس کی مثال تو ویسی ہے جیسے ٹرنک پر ہاتھ پھیرنے والا انسان۔ اُس کو نہ کپڑے دیکھنے اور نہ استعمال کرنے کی توفیق ہوئی، نہ اُس نے ہاتھوں سے اُن کپڑوں کو ٹٹولا، نہ اُس کے جسم نے انہیں پہنا اور نہ ہی پہن سکتا

ہے کیونکہ ٹرنک کو تالا لگا ہوا ہے۔ ایسے شخص کی مثال اُس شخص کی مثال کی طرح کس طرح ہو سکتی ہے جس کے پاس اس ٹرنک کی چابی ہے وہ چابی سے تالا کھولتا ہے، کپڑے پہنتا ہے اور اس سے اپنے جسم کو ڈھانکتا ہے اور اسے خوشنما بنا کر دوستوں کو دکھاتا ہے اِن دونوں میں تو کوئی نسبت ہی نہیں۔ تو جب تک قرآن شریف کو ہم کھول کر لوگوں کے سامنے نہیں لے آتے اور جب تک لوگوں کو اس سے اچھی طرح واقف نہیں کرا دیتے اُس وقت تک یہ سمجھ لینا کہ ہم کوئی تغیر پیدا کر لیں گے غلط ہے۔ اور ہماری حالت اُس برہمن کی سی ہے جس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ایک دن جبکہ بہت زیادہ سردی تھی نہانے کے لئے دریا پر گیا زیادہ سردی کی وجہ سے وہ راستہ میں ٹھٹھر رہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ اگر دریا میں نہایا تو بیمار ہو جاؤں گا لیکن چونکہ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ برہمن کو ضرور روزانہ دریا پر (دریا اگر پاس ہو) تو نہانا چاہئے اِس لئے باوجود سخت سردی کے وہ دریا کی طرف چل دیا۔ جب وہ دریا کی طرف جا رہا تھا تو راستہ میں اسے کوئی دوسرا برہمن آتا ہوا نظر آیا اُس کو دیکھ کر اُس نے کہا کیا کریں آج تو نہایا نہیں جاتا بڑی سردی ہے تم نے کیا کیا؟ دوسرے برہمن نے جواب دیا کہ میں نے تو یہ کیا کہ ایک کنکر اُٹھا کر دریا میں پھینکا اور کہا ''تورا شنان سومورا شنان'' یعنی تیرا نہانا میرا نہانا ہو گیا میں یہ کہہ کر واپس آ گیا۔ اس پر وہ برہمن کہنے لگا ''تورا شنان سومورا شنان'' یہی بات ہے تو پھر تیرا نہانا میرا نہانا ہو گیا۔ یعنی کنکر کا نہانا اِس برہمن کا نہانا ہو گیا اور اُس برہمن کا نہانا اِس دوسرے برہمن کا نہانا ہو گیا۔ یہی اِس وقت کے لوگوں کی حالت ہے جب کسی سے کوئی اس کے مذہب کے متعلق سوال کرے تو کہہ دیتے ہیں ہمارے مولوی صاحب خوب جانتے ہیں۔ گویا ان کے دماغوں کو زنگ لگ چکا ہے اور وہ بے کار ہو چکے ہیں۔ قرآن شریف کا جاننا تو الگ رہا اِن کی حالت تو اُس شخص کی طرح ہے جو صرف ٹرنک پر ہاتھ پھیر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے سب کچھ دیکھ لیا اور پا لیا۔

میں جس وقت حج کے لئے گیا تو میاں عبدالوہاب صاحب ایک شخص سہارن پور کے رہنے والے تھے وہ بھی حج کے لئے گئے ہوئے تھے وہ چونکہ بہت ہی سیدھے سادھے آدمی تھے اِس لئے لوگ اُن سے مذاق کرتے تھے۔ اُن کے پاس تھوڑے سے روپے تھے جو اُن کے لڑکوں نے اُن کو دیئے تھے کچھ شرارتی لوگ تھے وہ چاہتے تھے کہ وہ روپیہ اُن سے لے لیں۔ میں مصر کے

راستہ سے گیا تھا اور ہمارے نانا صاحب میر ناصر نواب صاحب مرحوم جو جہاز سیدھا عرب جاتا ہے اُس میں گئے تھے اُنہوں نے جب دیکھا کہ لوگ ان سے مذاق کرتے ہیں اور ان سے روپیہ لوٹ لینا چاہتے ہیں تو انہوں نے ان کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ وہ جہاز سے اُترے اور مجھ سے ملے تو میاں عبدالوہاب صاحب ان کے ساتھ تھے۔مَیں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ بڑا سادہ آدمی ہے اور اس کی سادگی کی وجہ سے کچھ شرارتی لوگ اِس کو لُوٹنا چاہتے تھے اس لئے اس کو میں نے اپنے ساتھ لے لیا۔ میں نے دیکھا کہ واقعی وہ بڑا سادہ آدمی تھا قرآن شریف کا ان کو کچھ پتہ نہیں تھا، نماز انہیں آتی نہیں تھی میں حیران تھا کہ جب اِن کو دین کا کچھ علم ہی نہیں تو آخر وہ کس طرح یہاں آئے؟ میں نے اُن سے پوچھا آپ کا مذہب کیا ہے؟ یہ سوال کر کے میں منٹ بھر خاموش انتظار کرتا رہا جب اُنہوں نے کوئی جواب نہ دیا تو میں سمجھا کہ شاید سنا نہیں۔ پھر میں نے اِسی سوال کو اونچی آواز سے دُہرایا کہ میاں عبدالوہاب! تمہارا مذہب کیا ہے؟ وہ کہنے لگے جلدی نہ کرو سوچ کر جواب دیتا ہوں۔ مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ سوچنے کا کیا مطلب، حساب تھوڑا ہی ہے کہ ضربیں دے رہے ہیں۔ میں نے کہا میاں عبدالوہاب! میں نے مذہب پوچھا ہے سوچنے والی بات کیا ہے؟ وہ کہنے لگے یونہی نہ گھبرا دیا کرو ذرا سوچ تو لینے دو۔ پھر میں نے کہا اس کا تو ہر ایک کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کا مذہب کیا ہے آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ کہنے لگے واپس جاؤں گا تو مُلّا سے لکھوا کر بھیجوں گا۔ میں نے کہا مَیں مُلّا کا مذہب نہیں پوچھ رہا آپ کا مذہب پوچھ رہا ہوں۔ پھر کہنے لگے ٹھہر جائیں ذرا سوچ تو لینے دیں آپ تو گھبرا دیتے ہیں۔تھوڑی دیر کے بعد سوچ سوچ کر کہنے لگے میرا مذہب ہے علیہ۔ میرے ذہن میں نہ آیا کہ علیہ کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا کہ علیہ تو آج تک کوئی مذہب نہیں سنا۔ پھر انہوں نے کہا تم تو گھبرا دیتے ہو سوچنے نہیں دیتے۔ خیر تھوڑی دیر تک علیہ علیہ کر کے کہنے لگے میرا مذہب ہے علیہ امام ۔اُس وقت میرا ذہن اِس طرف گیا کہ علیہ امام سے مطلب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔تب میں نے جان کر اُنہیں چڑانا شروع کیا کہ بتایئے آپ کا مذہب کیا ہے چپ کیوں ہیں؟ اِس پر وہ پھر کہنے لگے مَیں نے جو کہا ہے مُلّا سے لکھوا دوں گا۔ مَیں نے پھر کہا کہ میں مُلّا کا مذہب نہیں پوچھتا آپ کا پوچھتا ہوں۔آخر بڑا سوچ سوچ کر

انہوں نے کچھ اس قسم کا فقرہ کہا رحمۃ اللہ امام علیہ۔ اِس پر مَیں نے کہا میاں عبدالوہاب! آپ کے یہاں آنے کا کیا فائدہ تھا، آپ خواہ نخواہ اس بڑھاپے میں حج کے لئے چلے آئے آپ کو تو اسلام کا کچھ بھی پتہ نہیں۔ وہ بڑے غصہ میں آ کر بولے۔ میرے بیٹوں نے مجھے مجبور کیا کہ ابا! جا کر حج کر آؤ تب ہم خوش ہونگے مجھے کیا پتہ حج کیا ہوتا ہے۔ جب مسلمانوں کی یہ حالت ہو تو کیا اِس پر یہ امید کی جاتی ہے کہ خدا اور اُس کے رسول کی حکومت دنیا میں قائم ہوگی۔ جس شخص کو یہ پتہ نہیں کہ خدا اور رسول کیا چیز ہے وہ خدا اور رسول کی کیا حکومت قائم کرسکتا ہے وہ تو جب بھی قائم کرے گا اپنے نفس کی حکومت قائم کرے گا تو قرآن شریف جانے بغیر اور اس کو سمجھے بغیر خدا کی حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔

ہماری قربانیاں بے شک قابلِ قدر ہیں، ہمارے چندے بھی بے شک قابلِ قدر ہیں اور ہماری تبلیغ بھی قابلِ قدر ہے مگر ہم کس چیز کو قائم کرنا چاہتے ہیں؟ خدا اور اُس کے رسول کی حکومت کو؟ مگر خدا اور اس کے رسول کی حکومت بغیر قرآن شریف سمجھے قائم نہیں ہوسکتی۔ ہمیں کیا پتہ ہے کہ جس وقت اسلام کا جھنڈا گاڑا جائے گا اُس وقت کون زندہ ہوگا، ہمیں کیا پتہ ہے کہ اگر ہم زندہ بھی ہوں گے تو اسلام کا جھنڈا گاڑنے کی توفیق ہمیں ملے گی یا کسی اَور کو۔ کیونکہ ہر انسان ہر جگہ موجود نہیں ہوتا۔ پس کیا معلوم کہ جسے اسلام کا جھنڈا گاڑنے کی توفیق حاصل ہوگی وہ کون سا ہاتھ ہوگا۔ اگر اُن انسانوں کو جو ہمارے قائمقام ہونگے اگر اُن کے زمانہ میں جھنڈا گڑا یا اس جگہ پر جہاں جھنڈا گاڑا گیا جو ہمارا قائم مقام ہوا اگر اُس کو قرآن شریف کا پتہ نہیں ہوگا تو اُس نے کیا کرنا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے کہتے ہیں کہ ایک پٹھان تھا اُس کو خواہش پیدا ہوگئی کہ کسی کو کلمہ پڑھا کر مسلمان بناؤں۔ اُسی گاؤں میں جس میں وہ رہتا تھا ایک بنیا تھا ایک دن اُسے اکیلا دیکھ کر اُسے جوش آ گیا اُس نے اُسے پکڑ لیا اور کہا کلمہ پڑھ، نہیں تو مارتا ہوں۔ اُس نے کہا میں کلمہ کس طرح پڑھوں؟ میں تو مسلمان نہیں ہوں۔ کہنے لگا خو مسلمان ہے یا نہیں آج تم کو کلمہ ضرور پڑھوانا ہے کیونکہ تم کو مسلمان کر کے میں نے جنت میں جانا ہے۔ لالہ نے بڑی منتیں کیں اور ٹالتا رہا کہ شاید اِس عرصہ میں کوئی دوسرا آدمی آ جائے اور میرا چھٹکارا ہو مگر اتفاق کی بات کہ

اُس وقت کوئی دوسرا وہاں نہ پہنچا۔ بزدل آدمی کو جان زیادہ پیاری ہوتی ہے جب دیکھا کہ اتنی دیر سے کوئی نہیں آیا تو کہنے لگا اچھا تم کلمہ بتاتے جاؤ میں پڑھتا جاتا ہوں۔ پٹھان نے کہا خو تم آپ پڑھو۔ بنیے نے کہا میں ہندو ہوں مجھے کلمے کا کیا پتہ۔ اس پر پٹھان بولا خو تمہارا قسمت بڑا خراب ہے کلمہ تو مجھ کو بھی نہیں آتا، نہیں تو آج تم مسلمان ہو جاتا اور ہم جنت میں چلا جاتا۔ یہی قرآن نہ جاننے والوں کی حالت ہے۔ اس حالت میں کیا چیز ہے جو ہم دنیا کے سامنے لے کر جانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم بھی قرآن شریف جو خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی طرف پیغام ہے اس کو نہیں جانتے، اگر ہمیں اِس کا کچھ علم ہی نہیں اور اِس کی بجائے ہم اپنی باتیں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا میں کامیاب ہو جائیں گے تو یہ غلط بات اور لغو خیال ہے۔

ہر احمدی کو قرآن کریم پڑھنا چاہئے اور جو پڑھنا نہیں جانتے اُن کو سنا کر قرآن کریم سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئے اور یہ ہمارا اوّلین فرض ہے۔ اگر ہم یہ ارادہ کر لیں کہ سَو فیصدی افراد کو قرآن شریف کا ترجمہ سمجھا دیں گے اور اگر ہم اِس میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہماری فتح میں کوئی شک ہی نہیں اور ہماری روحانی حالت میں ایک عظیم الشان تغیر آ جائے گا۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ دوسرے مسلمانوں میں بعض لوگ قرآن شریف جانتے ہیں مگر اُن کے حالات بھی خراب ہیں پھر ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ اِس کو جاننے کی کوشش کریں گے اُن کی یہ حالت نہ ہوگی؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ اول تو لفظوں کا جاننا اور حکمت کا جاننا دو مختلف اَشیاء ہیں۔ دوسرے میں کہتا ہوں کہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا یہ واقعہ ہے یا نہیں کہ جب ملک میں طاعون یا ہیضہ نہیں ہوتا تو اُس ملک کا کمزور سے کمزور انسان بھی طاعون اور ہیضہ سے محفوظ ہوتا ہے اور جب ملک میں طاعون اور ہیضہ ہوتا ہے تو پھر طاقتور سے طاقتور انسان بھی طاعون اور ہیضہ سے محفوظ نہیں ہوتا۔ اسی طرح جس قوم میں جاہل بکثرت موجود ہوتے ہیں وہاں عالموں کا ایمان بھی خطرہ میں ہوتا ہے اور جس قوم میں علم اچھی طرح پھیلا دیا جاتا ہے اور جہالت کو دور کر دیا جاتا ہے اُس میں عالموں کے ایمان کی مضبوطی کے ساتھ جاہلوں کا ایمان بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کچھ لوگ غیروں میں بھی قرآن شریف جاننے والے موجود ہیں لیکن اوّل

تو اُن کا علم محض لفظی ہے دوسرے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اُن کے دائیں بائیں کون کھڑے ہیں؟ ان کے دائیں بائیں کثرت سے جاہل اور خدا سے دُور لوگ کھڑے ہیں جو اُن کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں پس وہ تو چند لفظی طور پر قرآن پڑھے ہوئے لوگ ہیں جو کہ اپنے آپ کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ قوم کو، جبکہ ہماری جماعت میں بے شک حقیقی طور پر قرآن جاننے والے لوگ موجود ہیں لیکن اِن کی تعداد اس قدر کم ہے کہ وہ بھی اپنی جماعت کو پورا فائدہ نہیں پہنچا سکتے کیونکہ وہ نسبتی طور پر اتنے تھوڑے ہیں کہ ان کے نور پر جہالت کی ظلمت کے چھا جانے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ عوام احمدیوں تک بھی قرآن شریف پہنچائیں۔ ان تک قرآن شریف پہنچانا نہ صرف ان کے لئے ضروری ہے بلکہ اس میں اپنی بھی حفاظت ہے۔ احمق ہے وہ انسان جس کے گاؤں میں ہیضہ آجائے اور وہ کہے کہ میرے گاؤں میں صرف ایک انسان کو ہیضہ ہوا ہے اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس گاؤں میں ایک آدمی کو ہیضہ ہوا ہے تو یقیناً اس کا بیٹا بھی ہیضہ سے محفوظ نہیں لیکن اگر اس کے گاؤں کے پرلے کنارے پر ہیضہ کی ایک واردات ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے اپنے بیٹے کو ہیضہ ہوا ہے تو نہ صرف وہ بلکہ اُس کا گاؤں بھی ہیضے سے بچ جائے گا۔ اسی طرح اگر قوم کے تمام افراد روحانی عالم نہیں تو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے گاؤں میں ہیضہ آگیا اور جب ہیضہ آگیا تو کوئی نوجوان بھی اس سے محفوظ نہیں۔ اگر اِس قوم میں سے کُلّی طور پر جہالت نکال دیں اور جہالت کا مرض دور کر دیں اور اگر اپنے تمام افراد کو کُلّی طور پر اسلامی علوم سے آشنا کر دیں تو پھر گویا ہم نے ہیضہ کو کُلّی طور پر اپنی قوم سے نکال دیا اور اس صورت میں صرف مضبوط انسان ہی نہیں بلکہ کمزور ایمان والے انسان کو بھی روحانی ہیضہ نہیں ہوسکتا۔ پس آپ لوگ بھی جو یہاں پڑھنے کے لئے آئے ہیں آپ کا یہ کام نہیں کہ یہاں سے پڑھ کر جائیں اور علم کو اپنے تک ہی محدود رکھیں بلکہ آپ کا کام یہ ہے کہ جو کچھ پڑھ کر جائیں لوگوں کو جا کر سنائیں۔ ہر شخص جو تم میں سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کر کے جائے گا وہ یہ ذمہ داری لے کر جائے گا کہ دوسروں کو بھی علم پڑھائے۔ اگر وہ واپس جا کر اپنے علاقے کے ہر فرد کو قرآن نہیں سکھائے گا تو وہ خدا تعالیٰ کے سامنے مجرم کی حیثیت میں پیش ہوگا۔

جب تک یہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع پیدا نہیں ہوا تھا تم مجرم نہیں تھے مگر اب جبکہ وہ موقع

پیدا ہو گیا ہے اگر تم نے سُستی سے کام لیا اور جو کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے اِس کو پورا نہ کیا تو تم خدا تعالیٰ کے سامنے مجرم کی صورت میں پیش ہو گے۔ شاید تم میں سے بعض یہ کہیں کہ پھر تو علمِ قرآن کا حاصل کرنا بجائے فائدہ کے وبالِ جان ہو گیا یہ تو ہم سے غلطی ہوئی کہ ہم یہاں آ گئے۔ اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو تو یہ صرف ایک بے حقیقت وہم ہوگا۔

دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جہاد کا موقع آیا بہت سے لوگ اس میں شامل ہوئے اور کچھ نہ ہوئے۔ اب ظاہر ہے کہ جنگ میں نہ جانیوالا شخص اس بات کا مجرم نہیں تھا کہ اُس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کی حفاظت کیوں نہیں کی بلکہ وہ مجرم تھا اس بات کا کہ وہ جہاد میں کیوں نہیں گیا۔ لیکن ایسے لوگ جو جہاد میں تو شامل ہوئے لیکن اُنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کی حفاظت نہیں کی اور اُس وقت جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ ہوا انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کی حفاظت کی خاطر اپنی جان قربان نہیں کی وہ ضرور مجرم ہوئے اِس بات کے کہ اُنہوں نے اپنے فرائض کو صحیح طور پر انجام نہیں دیا۔ مجرم دونوں ہوئے لیکن دونوں کے جُرم کی نوعیت مختلف تھی۔ جو جہاد میں شامل نہ ہوئے ان کے جُرم کی نوعیت اور تھی اور بعض منافق جو صحابہؓ سے مل کر جہاد میں شامل تو ہو جاتے تھے مگر اُن کی غرض اسلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت نہ ہوتی تھی اُن کے جُرم کی نوعیت اَور تھی۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیوں مجرم ہو گئے۔ وہ تو میدانِ جنگ میں گئے تھے کیونکہ مجرم کی نوعیت مقامات کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ ہر مقام سے جب انسان ترقی کرتا ہے تو اُس کے اس مقام کے بدلنے کے ساتھ ہی اس کی ذمہ داریوں کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے اور ان کے ادا نہ کرنے کی صورت میں اس کے جُرموں کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ اِس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک انسان جب پہلی سیڑھی پر ہوتا ہے تو اُس کا پہلی سیڑھی سے گرنے کا امکان ہوتا ہے لیکن جب وہ پہلی سیڑھی سے دوسری سیڑھی پر چڑھ جائے تو اُس کے لئے دوسری سیڑھی سے گرنے کا امکان تو ہوتا ہے لیکن پہلی سیڑھی سے نیچے گرنے کا امکان نہیں ہوتا کیونکہ وہ پہلی سیڑھی پر نہیں ہے لیکن جب وہ تیسری سیڑھی پر چڑھ جائے تو دوسری سیڑھی سے گرنے کا امکان نہیں رہتا۔ ایک شخص ایک مقام پر کھڑا ہے اُس سے کچھ گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ ایک اور شخص ہے جو اُس سے اوپر کے مقام پر کھڑا ہے اُس سے اَور قسم کی غلطیاں سرزد ہو سکتی

ہیں لیکن وہ غلطیاں سرزد نہیں ہوسکتیں جو نچلے مقام والے انسان سے ہوئیں۔ اسی طرح ایک تیسرا شخص ہے جو دوسرے شخص سے زیادہ اونچے مقام پر ہے اُس سے غلطیاں تو سرزد ہوسکتی ہیں لیکن وہ نہیں جو اُس سے نچلے مقام والے انسان سے سرزد ہوسکتی ہیں۔ جرائم تو سب سے ہی ہوں گے لیکن جرائم کی نوعیت ہر مقام پر بدل جائے گی۔ جو سب سے اوپر کے درجہ پر ہوگا اُس کے جرائم کی نوعیت اور ہوگی اور جو اُس سے نچلے درجہ پر ہوگا اُس کے جرائم کی نوعیت اور ہوگی اور جو سب سے نچلے درجہ پر ہوگا اُس کے جرائم کی نوعیت اور ہوگی۔ جو لوگ پڑھنے کے لئے نہیں آئے وہ مجرم ہیں اِس بات کے کہ خدا تعالیٰ نے اُن کو موقع دیا کہ وہ روحانی آنکھیں پیدا کرلیں لیکن اُنہوں نے پیدا نہ کیں اور اندھے رہے۔ اور تم میں سے جو آنکھیں پیدا کرلیں گے لیکن اِس کے ذریعہ اندھوں کو راستہ نہیں دکھلائیں گے تو وہ مجرم ہوں گے اِس بات کے کہ انہوں نے اندھوں کو پکڑ کر منزلِ مقصود تک کیوں نہ پہنچایا۔ پس یہ مت خیال کرو کہ کسی صورت میں بھی تم ذمہ داری سے بچ سکتے تھے تم ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے تھے صرف تمہاری ذمہ داری کی نوعیت بدل سکتی تھی۔ اگر تم قرآن کریم پڑھنے نہ آتے تو تم پر یہ الزام قائم ہوتا کہ ان کو روحانی آنکھیں حاصل کرنے کا موقع مل سکتا تھا مگر یہ اندھے رہے اور اب اگر قرآن کریم پڑھ کر دوسروں کو نہ سکھاؤ گے تو یہ الزام ہوگا کہ اِن کو آنکھیں ملی تھیں پھر اِنہوں نے اندھوں کو کیوں راستہ نہ دکھلایا۔ تو آپ کا صرف یہ کام نہیں کہ جب قرآن شریف پڑھ کر جائیں تو اسے اپنے تک ہی محدود رکھیں بلکہ آپ کا یہ بھی کام ہے کہ اپنے وطن واپس جا کر اپنی جماعتوں کو قرآن شریف پڑھائیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ قرآن شریف پڑھائیں تو زیادہ منشاء میرا یہی ہوتا ہے کہ دوسروں کو قرآن شریف سنائیں کیونکہ ہمارے ملک کے اکثر لوگ پڑھے ہوئے نہیں۔

دوسرا فرض آپ کا یہ ہے کہ چونکہ آپ سارا قرآن شریف اِن دنوں میں نہیں پڑھ سکیں گے اور ساری صَرف ونحو بھی نہیں پڑھ سکیں گے بلکہ اِس کے موٹے موٹے مسائل بھی شاید اِس دفعہ ختم نہ کرسکیں گے اِس لئے آپ آج ہی سے دل میں پکا عہد کریں کہ اگلے سال آ کر اپنی تعلیم مکمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ آدھی تعلیم حاصل کرنے سے آپ کی ذمہ داری ایک نئی شکل اختیار کرلیتی ہے ایک شخص جو کسی کے گھر میں کرائے پر رہتا ہے اگر وہ اُس مکان کو خراب کرتا

ہے، اُس کو ضائع کرتا ہے تو اُس کو محلے والے بھی اور مالک مکان بھی بُرا کہتے ہیں۔لیکن ایک اور شخص جو ایک مکان کی دیواریں بنا کر چھوڑ دیتا ہے اور مکان کی تکمیل نہیں کرتا اس کی وفات کے بعد اس کے محلے والے ہی اُسے بُرا نہیں کہتے اُس کی اولاد بھی اُسے بُرا کہتی ہے کہ ہمارے باپ نے یونہی روپیہ ضائع کرا دیا۔ اگر وہ یہاں روپیہ نہ لگاتا تو کسی اور جگہ کام آ جاتا۔ اور ہمسائے کہتے ہیں اِس کی اینٹیں گرتی ہیں، بے چارے راہ گیروں کے سروں پر لگتی ہیں ان کے سر پھٹ جاتے ہیں یا لوگوں کو ٹھوکریں لگتی ہیں اگر مکان بنانا تھا تو مکمل بناتا، نہیں تو نہ بناتا۔ اب آپ لوگ بھی سوچیں کہ آپ لوگ سارا قرآن شریف ختم کر کے نہیں جا سکتے اس لئے آپ بھی علمِ دین کے مکان کی دیواریں کھڑی کر کے جا رہے ہیں، نہ چھت پڑے گی، نہ دروازے لگیں گے، نہ پلستر ہوگا پس آپ کو یہ وعدہ کر لینا چاہئے اور فیصلہ کر لینا چاہئے کہ اب ہم اپنی ساری توجہ اِس طرف لگا دیں گے اور اِس سارے علم کو حاصل کر کے چھوڑیں گے اور آپ کو یہ فیصلہ کر لینا چاہئے کہ اگلے سال پھر اِنْشَاءَ اللّٰہُ آئیں گے اور اپنے علم کی تکمیل کریں گے یہاں تک کہ سارا علم آ جائے۔

دوسرے آپ میں سے جسے خدا تعالیٰ اگلے سال آنے کی پھر توفیق دے وہ دو تین اَور کو تحریک کر کے ضرور اپنے ساتھ لائے تا علم حاصل کر کے واپس اپنے وطنوں میں جا کر پڑھانے والوں کی تعداد بڑھتی چلی جائے۔ ہماری جماعت اب اتنی ہے کہ ہزار ہا بھی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ اب اسّی نوے کا تو سوال ہی نہیں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ہزار ہا ایسے مبلغ پیدا کریں جنہوں نے قرآن شریف پڑھا ہوا ہو، تا وہ اپنے اپنے وطن واپس جا کر لوگوں کو قرآن شریف پڑھائیں۔ یہی چیز تھی جس کی وجہ سے مجھے خواہش تھی کہ میں آپ لوگوں میں آ کر تقریر کروں اور آپ کو آپ کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاؤں۔

اب میں آپ لوگوں کو مختصر الفاظ میں کچھ ایسی باتیں بتاتا ہوں جو قرآن کریم کے سمجھنے کے متعلق ہیں۔ جب آپ قرآن شریف پڑھیں گے تو وہ باتیں جو اُستاد آپ کے کانوں میں ڈالیں گے اگر آپ اُن کو یاد رکھیں گے تو آپ کی حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقولہ کے مطابق صرف ایسی ہوگی جیسے ایک زمین پر پانی پڑتا ہے اور وہ اُسے محفوظ رکھتی ہے دوسرے لوگ اس

سے آ کر پانی پیتے ہیں یا پانی لے جاتے ہیں یہ درمیانہ درجہ کے لوگ ہیں۔ رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں علم کے لحاظ سے تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جن کی مثال اُس زمین کی سی ہوتی ہے جو ڈھلوان ہوتی ہے اور سخت بھی جس پر پانی ٹھہرتا ہی نہیں۔ ایک زمین ایسی ہوتی ہے جو نشیب میں ہوتی ہے اُس پر پانی پڑتا ہے اور جمع ہو جاتا ہے لیکن پانی تہہ میں نہیں جاتا وہ زمین پانی نہیں پیتی لیکن چار پائے آتے اور پیتے ہیں۔ تیسری مثال ایسی زمین کی ہے جو عمدہ قسم کی ہوتی ہے جس میں روئیدگی اُگانے کی طاقت ہے اُس میں ڈھلوان نہیں کہ پانی بہہ جائے اور وہ کنکریلی نہیں کہ پانی جذب نہ کر سکے بلکہ جب آسمان سے بارش ہوتی ہے تو وہ اُس پانی کو جذب کر لیتی ہے، پیتی ہے پھر سبزہ اُگاتی ہے، پھل پھول اور اناج اُگاتی ہے دوسرے لوگ آتے ہیں اور اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، انسان اُس سے پھل کھاتا ہے اور اناج حاصل کرتا ہے، جانور اُس سے چارہ حاصل کرتے ہیں وہ زمین آپ بھی پانی پیتی ہے اور دوسروں کو بھی پلاتی ہے۔[۳]

یہی تین حالتیں انسان کی ہیں۔ ایک عالم ایسے ہوتے ہیں جو علم کو حاصل کرتے ہیں اور حاصل کر کے لوگوں تک پہنچاتے ہیں اُن کی مثال اُس زمین کی ہے جو پانی پیتی ہے اور روئیدگی اُگاتی ہے آپ بھی فائدہ حاصل کرتی ہے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتی ہے۔ ایک ایسے عالِم ہوتے ہیں جو علم حاصل کرتے ہیں اور اُسے اُسی شکل میں محفوظ رکھتے ہیں وہ عالِم تو ہوتے ہیں لیکن بے عمل، خدا اور رسول کی باتیں تو لوگوں کو بتاتے ہیں لیکن خود اُن پر عمل نہیں کرتے۔ اُن کی مثال ایسی نشیب زمین کی ہے جو پانی جمع کر لیتی ہے اُسے خود تو پیتی نہیں لیکن دوسروں کو پلا دیتی ہے۔ تیسری قسم کے عالموں کی مثال ڈھلوان زمین کی ہے وہ علم حاصل کرتے ہیں لیکن اس کو یاد نہیں رکھتے وہ نہ خود اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں جیسا کہ ڈھلوان کنکریلی زمین سے پانی بہہ جاتا ہے اسی طرح ان پر سے علم گزر جاتا ہے لیکن اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ پس اگر آپ لوگوں نے جو پڑھا ہے اُس کو بُھلا دیا تو رسول کریم ﷺ نے آپ لوگوں کی مثال یہ بتائی ہے کہ جیسے کنکریلی ڈھلوان زمین جس نے نہ آپ پانی پیا اور نہ دوسروں کو پلایا۔ اگر آپ نے قرآن شریف کی باتیں سُنیں اور لوگوں کو جا کر سمجھائیں لیکن خود

اُن پر عمل نہ کیا تو آپ کی مثال اُس جوہڑ کی سی ہوگی جس میں پانی جمع ہو جاتا ہے لیکن وہ خود اس میں سے پانی نہیں پیتا ہاں لوگوں کو پلا دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ نے قرآن شریف کی باتیں سُنیں اور اُن پر عمل کیا اور دوسروں کو بھی قرآن شریف پڑھایا اور سمجھایا تو آپ کی مثال ایسی اچھی زمین کی ہوگی جو خود پانی پیتی ہے اور دوسروں کو گھاس، چارہ، پھل اور پھول دیتی ہے اور بنی نوع انسان اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ یہی وہ زمین ہے جس کے لئے زمیندار خواہش کرتے ہیں اور جس کو حاصل کرنے کے لئے ہر ایک خواہش کرتا ہے۔ راجپوتانہ کے علاقہ میں ہزارہا میل کے میدان بیابان پڑے ہیں لیکن کوئی شخص ان کے لئے خوشی سے ایک پیسہ دینے کی بھی خواہش نہیں رکھتا لیکن لائل پور اور سرگودھا کے علاقوں میں پچیس پچیس ہزار روپے دے کر ایک مربع زمین خریدتے ہیں۔ نیلامی میں تو یہاں تک مول پڑتا ہے کہ ایک دوست نے مجھے بتایا کہ لوگوں نے ایک جگہ پانچ ایکڑ زمین کی ایک لاکھ کئی ہزار بولی دی، تو اچھی زمین ہی قیمتی ہوتی ہے۔ پس اگر آپ قیمتی وجود بننا چاہتے ہیں تو آپ اِس پڑھے ہوئے پر عمل کریں اور جو کچھ یہاں سے سبق حاصل کر کے جائیں اُس کو خود بھی استعمال کریں اور اس سے فائدہ اُٹھائیں اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔

میں ایک اور بات بیان کرتا ہوں جو رسول کریم ﷺ کی حدیث کی تردید نہیں کرتی بلکہ تائید کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ نے جو زمین کی مثال دی تھی اس سے ہمیں ایک اور سبق ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک زمین ایسی ہوتی ہے جو پانی جذب کرتی ہے اور پانی ہی اُگلتی ہے۔ ایک زمین ایسی ہوتی ہے جو پانی جذب کرتی ہے لیکن پانی نہیں نکالتی بلکہ اس کی بجائے انگور، انار، آم، گندم، کپاس، گھاس، چارہ وغیرہ نکالتی ہے۔ اسی طرح اگر آپ لوگوں نے جو کچھ یہاں پڑھا وہی واپس جا کر پڑھایا تو آپ کی مثال ایسی زمین کی ہوگی جو پانی پیتی ہے اور پانی نکال دیتی ہے لیکن اگر آپ دوسری مثال کے مصداق بننا چاہتے ہیں تو آپ میں یہ قابلیت پیدا ہونی چاہئے کہ آپ کو اُستاد جو باتیں بتلائیں اُن میں تغیر و تبدل کر کے ایک نئی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اگر آپ کو صرف وہی نکتے یاد رہتے ہیں جو اُستاد نے بتائے ہیں تو آپ ہرگز اس مثال کے مصداق نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر ان باتوں نے آپ کے دل میں ہیجان

پیدا کر دیا ہے اور آپ کے جذبات میں ہیجان پیدا کر دیا ہے اور آپ میں غور کرنے کی عادت پیدا ہوگئی ہے اور آپ کے اندر ایسا تقویٰ پیدا ہوگیا ہے جس سے آپ پر قرآن شریف کے معارف کھل جاتے ہیں تو آپ کی مثال اُس زمین کی سی ہوگی جو پانی پیتی ہے اور اس کے نتیجے میں پھل پھول نکالتی ہے۔ پس آپ لوگ اس زمین کی طرح نہ ہوں جو پانی کے بدلے پانی نکال دیتی ہے بلکہ اُس زمین کی طرح ہوں جو پانی پی کر اس کے نتیجہ میں گھاس چارہ اور پھل اور پھول پیش کرتی ہے۔ تو جب تک آپ میں یہ قابلیتیں پیدا نہ ہو جائیں کہ جو باتیں آپ مدرسہ سے سنتے ہیں ان کو بدل نہ ڈالیں اور چارے کی شکل میں، پھل پھول کی شکل میں اور غلّے کی شکل میں تبدیل کر کے پیش نہ کریں اُس وقت تک آپ پوری طرح اِس حدیث کے مصداق نہیں ہو سکتے۔ جو انسان بھی علم ایسی صورت میں حاصل کرتا ہے کہ اپنے اُستاد کی بتائی ہوئی باتوں کو اُسی شکل میں رہنے دیتا ہے وہ جہالت اور بے وقوفی کا مرتکب ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں لطیفہ مشہور ہے کہ کسی بادشاہ نے اپنے بیٹے کو کسی عالِم کے پاس بٹھایا جسے ہر قسم کے علوم، علمِ نجوم اور علمِ ہیئت وغیرہ آتے تھے اور اُسے کہا کہ اِس کو تمام علوم میں ماہر کر دو۔ جب وہ علوم سیکھ چکا تو بادشاہ نے کہا میں اِس کا علمِ نجوم میں امتحان لیتا ہوں۔ اُس نے اپنی مٹھی میں انگوٹھی کا ایک نگینہ پکڑ لیا اور اپنے بیٹے سے پوچھا بتاؤ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اُس نے حساب لگا کر کہا کہ آپ کے ہاتھ میں چکی کا پاٹ ہے۔ بادشاہ اُس کے اُستاد پر بڑا ناراض ہوا اور کہا کہ تم نے میرے لڑکے کو کیا پڑھایا ہے؟ عالم نے کہا حضور میں نے جو پڑھایا ہے ٹھیک ہے میں نے اُسے ایسا طریقہ بتایا تھا جس سے پتہ لگ جائے کہ آپ کے ہاتھ میں کوئی پتھر کی چیز ہے سو اُس نے یہ بات معلوم کر لی مگر میں آپ کے لڑکے کے دماغ میں بیٹھ نہیں سکتا تھا کہ اِسے عقل بھی دیتا جاؤں، آپ کے بیٹے کے دماغ میں اتنی عقل ہی نہیں کہ وہ معلوم کر سکے کہ مٹھی میں چکی کے پاٹ کا پتھر نہیں آ سکتا مٹھی میں تو نگینہ ہی آئے گا۔ پس یہ نہ ہو کہ آپ لوگ اِس قسم کی جہالت کے مرتکب ہوں اور جو علم یہاں سے لے کر جائیں اُسے اسی طرح لفظاً لفظاً دُہرانے لگ جائیں اور یہ نہ دیکھیں کہ دوسرا کس صورت میں اعتراض کر رہا ہے اور ہم جواب کیا دے رہے ہیں۔ وہ آپ کے مقابل پر ایک نیا اعتراض پیش کر رہا ہے لیکن آپ ہیں کہ اُستاد کی بات ہی

دُہراتے چلے جاتے ہیں صرف میاں مٹھو کہنا جانتے ہیں اور کچھ بھی نہیں جانتے۔

پس آپ میں یہ قابلیت پیدا ہونی چاہئے کہ آپ نے جو قرآن شریف کی باتیں سُنی ہیں ان کے لئے معنی استنباط کر کے دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس سلسلہ میں بعض ہدایات دوں لیکن اب وقت نہیں رہا دوسرے گلے کی خرابی کی وجہ سے بھی میں زیادہ بول نہیں سکتا لیکن میں نے اپنی بعض کتابوں میں قرآن شریف کی تفسیر کے اصول لکھے ہیں اُن کو پڑھیں اور اُن پر غور کریں اور اُن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

ایک گُر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کبھی اور کبھی اور کبھی بھی اپنے دشمنوں کی بات کو مروڑنے کی عادت نہ ڈالو۔ جو دشمن کی بات کو مروڑتے ہیں وہ دشمن کی بات کو نہیں مروڑتے بلکہ وہ اپنی عقل کو مروڑتے ہیں۔ میں نے بہت لوگوں کو دیکھا ہے کہ دشمن کی باتوں کو مضحکہ خیز بنا کر پیش کرتے ہیں اور پھر اُن پر خود ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں بظاہر وہ اُس کا مذاق اُڑا رہے ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ اُس کا مذاق نہیں اُڑا رہے ہوتے بلکہ اپنے خود ساختہ خیالات کا مذاق اُڑا رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا دماغ علم حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ دشمن کے اعتراضوں کو مروڑتے ہیں اور اپنے مطلب کے مطابق پیش کرتے ہیں اور مصنوعی باتوں سے انسان کو پکڑنا چاہتے ہیں اور اِس پر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق یہ لکھ لکھ کر بڑے خوش ہوتے تھے کہ مرزا غلام احمد تو مضمون نگار ہے اور حکیم نورالدین ایک طبیب ہے ہاں یہ مان لیتا ہوں کہ مولوی محمد احسن صاحب امروہی کچھ علمیت رکھتے ہیں اور پھر اس پر بڑے خوش ہوتے تھے کہ میں نے بڑا تیر مارا ہے لیکن اب مرنے کے بعد اُن کو کون یاد کرتا ہے؟ مگر یہاں خدا تعالیٰ ہر گھر، ہر گاؤں اور ہر ملک سے لوگوں کو کھینچ کھینچ کر لا رہا ہے اور ان کو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غلاموں کے قدموں میں ڈال رہا ہے۔ حضرت مسیح موعودؑ کے دعویٰ سے پہلے آپ کے پاس ایک شخص بیمار ہو کر آیا اور حضرت مسیح موعودؑ کے سلوک کو دیکھ کر یہیں رہ پڑا۔ وہ ایسا بے وقوف تھا کہ مٹی کا تیل کھانے میں ڈال کر کھا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ چکنائی ہی کھانی ہے کوئی دوسرا تیل نہ کھایا یہ کھا لیا۔ اُس وقت یہاں تار گھر نہیں ہوتا تھا تار دینے کے لئے آدمی بٹالے جاتے تھے یہ بھی تار دینے کے لئے

بٹالے جاتا۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی روزانہ اسٹیشن پر جاتے تھے اور لوگوں کو قادیان آنے سے روکتے تھے ممکن ہے شاذونادر بعض لوگوں کو ورغلا کر واپس بھیج دینے میں کامیاب ہو جاتے ہوں گے۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ میں یہاں کا رہنے والا ہوں مرزا صاحب کو خوب جانتا ہوں آپ وہاں نہ جائیں۔ ایک دن مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کو اسٹیشن پر کوئی بھی آدمی نہ ملا مذکورہ بالا شخص کو جس کا نام پیرا تھا اور جو تار دینے بٹالہ گیا تھا اُنہوں نے دیکھ لیا اور اُس کو تبلیغ کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اُسے جا کر کہا تجھ پر کیا مار پڑی ہے کہ تو مرزا صاحب کے قابو آ گیا ہے تو نے آخر وہاں کیا دیکھا ہے؟ اُس نے یہ واقعہ خود آ کر قادیان سنایا اور بتایا کہ پہلے میں حیران ہوا کہ کیا کہوں مجھے آتا تو کچھ ہے نہیں اور حقیقتاً وہ تھا بھی جاہل اور احمدیت سے بالکل ناواقف چونکہ اُس کے رشتہ داروں نے اُسے چھوڑ دیا تھا اور بیماری میں اُس کا علاج نہیں کرایا تھا اِس لئے وہ اُن کو چھوڑ کر قادیان میں ہی رہ گیا تھا حضرت مسیح موعود نے اُس کا علاج کیا اِس لئے وہ حضرت مسیح موعود کے حُسنِ سلوک کو دیکھ کر یہیں رہ پڑا مگر باوجود جاہل ہونے کے اُس کی فطرت نے اُسے جواب سمجھا دیا۔ چنانچہ اس کے اپنے بیان کے مطابق مولوی صاحب کو یہ جواب دیا کہ مولوی صاحب! میں تو اَن پڑھ ہوں اور مجھے کچھ نہیں آتا مگر ایک بات میں دیکھتا ہوں وہ یہ کہ مرزا صاحب اپنے گھر سے نہیں نکلتے ، لوگ اطلاع کرواتے ہیں ، بعض اوقات کسی مجبوری کی وجہ سے مرزا صاحب دیر تک باہر نہیں آتے اور کہلا بھیجتے ہیں کہ طبیعت اچھی نہیں اِس وقت نہیں آ سکتے اور گو ملنے والے بڑے بڑے آدمی ہوتے ہیں لیکن چپ کر کے دروازے کے آگے بیٹھے رہتے ہیں اور اگر مصافحہ ہو جاتا ہے تو بڑے خوش ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں بڑا کام ہو گیا۔ مگر مولوی صاحب! میں اکثر بٹالہ آتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ آپ ہمیشہ اسٹیشن پر آتے ہیں اور لوگوں کو ورغلاتے ہیں لیکن پھر بھی لوگ آپ کی نہیں مانتے اور مرزا صاحب کی طرف چلے جاتے ہیں اور پھر کہا کہ مولوی صاحب! آپ کی تو جوتیاں بھی اس کام میں گھس گئی ہونگی مگر سنتا کوئی نہیں آخر کچھ تو مرزا صاحب میں بات ہوگی جو ایسا ہو رہا ہے۔ تو یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے جس پر نازل ہوتا ہے۔

بعض اوقات لوگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتراض ہوتا دیکھ کر اُس کو اُلٹنے

لگ جاتے ہیں یا بعض اوقات غصے میں آ جاتے ہیں یہ طریقہ صحیح نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جب بھی کوئی آدمی آ کر کوئی سوال کرتا تو آپ اُس کا صحیح جواب دیتے اور کوئی ایچ پیچ نہ کرتے خواہ دشمنوں کو اس سے ہنسی کا موقع مل جاتا۔ میرے پاس بھی ایک دفعہ دو مولوی دیوبند کے آئے۔ اُن کو پتہ تھا کہ میں کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا ہوا۔ میں اُس وقت لاہور میں دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی نے آتے ہی سوال کیا آپ نے کیا پڑھا ہوا ہے؟ میں نے کہا مَیں نے آپ کی تعریف علم کے مطابق کچھ نہیں پڑھا۔ وہ کہنے لگے آخر کسی مدرسے میں کچھ تو پڑھا ہوگا۔ میں نے کہا میں نے کسی مدرسے میں کچھ نہیں پڑھا۔ تو وہ کہنے لگے آپ نے کسی عربی کے مدرسے میں علومِ اسلامی حاصل نہیں کئے؟ میں نے کہا نہیں بالکل نہیں۔ وہ کہنے لگے تو اِس کا یہ مطلب ہے کہ آپ علومِ اسلامی سے کورے ہیں میں نے مسکرا کر کہا بالکل نہیں۔ اُس وقت اُس کے ساتھ جو دوسرا مولوی آیا تھا وہ بھی پہلے تو اعتراض میں شریک تھا لیکن اُس نے جب میرے چہرے پر نظر ڈالی تو مجھے مسکراتا دیکھ کر چپ نہ رہ سکا اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ ان کا مطلب اِس سے کچھ اَور ہے۔ اُس کے ساتھی نے کہا اور کیا مطلب ہوسکتا ہے واضح بات ہے۔ اِس پر دوسرے مولوی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ آخر اسلام کے مبلّغ ہیں آپ کو اسلام کی کچھ تو واقفیت ہوگی۔ میں نے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جس مکتبہ سے علم حاصل کیا تھا اُسی سے میں نے کیا ہے اور وہی کتاب میں نے پڑھی ہے۔ میں دیوبند میں نہیں پڑھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مدرسہ میں پڑھا ہوں۔ بے شک میں آپ کے علم کے لحاظ سے بڑا جاہل ہوں جس طرح آپ جاہل ہیں میرے علم کے لحاظ سے۔ میرے اِس جواب سے اُن پر ایسی اوس پڑی کہ پھر نہیں بول سکے۔ تو جب کوئی آپ پر اعتراض کرے یا کوئی سوال پوچھے تو اس کا صحیح جواب دینا چاہیئے اُس کو موڑنا توڑنا نہیں چاہیئے۔

ہماری جماعت کے بعض دوست بعض اوقات دشمن کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ غلط طریقہ ہے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو علم میں نے سیکھا ہے اس کا معتد بہ حصہ مجھے اسی طرح آیا ہے کہ جب کبھی بھی کوئی دشمن قرآن شریف پر کوئی اعتراض کرتا ہے میں اس

کے آگے اعتراض کو اور زیادہ مضبوط کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید وہ اس کو بیان نہ کر سکا ہو کیونکہ بعض اوقات کچھ باتیں بیان کرتے ہوئے نظر انداز ہو جایا کرتی ہیں اس لئے شاید کچھ حصہ نظر انداز ہو گیا ہو تو میں اعتراض کو مضبوط کر کے پھر اس پر غور کرتا ہوں اور جب خدا تعالیٰ مجھے اس کا جواب سمجھاتا ہے تو وہ مکمل جواب ہوتا ہے۔ اور جب میں کسی اعتراض کا جواب دیتا ہوں تو وہ اُس کی تسلی سے بھی زیادہ ہوتا ہے اور اُس میں اُس کے اعتراض سے بھی زیادہ مواد موجود ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم ہنسیں اور تمسخر میں اُس کے اعتراض کو اُڑانے کی کوشش کریں تو ظاہر ہے کہ ہمارا جواب دشمن کے اعتراض کے بعض پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالے گا اور یقیناً خود کمزور ہوگا اور ساری حقیقت پر مشتمل نہیں ہوگا اِس وجہ سے اعتراض کرنے والے کے دل میں بھی شکوک باقی رہیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن شریف پر جتنے اعتراضات میں نے اپنے ذہن میں کئے ہیں شاید اتنے اعتراضات سارے مخالفِ اسلام مصنفین نے بھی نہ کئے ہونگے۔ چونکہ میں نے قرآن شریف کے مضامین کو حل کرنے کیلئے بے دردی سے اعتراضات کئے اس لئے اس کی حقیقت بھی مجھ پر زیادہ کھلی اور جیسے ڈاکٹر جب پیٹ کی کسی بیماری کی وجہ سے اپنے بچہ کا آپریشن کرتا ہے اور اُس کا پیٹ پھاڑ دیتا ہے تو وہ اُس کا دشمن نہیں کہلاتا کیونکہ وہ خدمت کر رہا ہوتا ہے اور خارجی مواد کو نکال کر صحت کو درست کر دیتا ہے۔ اِسی طرح جب کبھی کوئی شخص قرآن شریف پر کوئی اعتراض اس لئے کرتا ہے کہ ہے تو یہ خدا تعالیٰ کی کتاب، غلطی اِس میں نہ نکلے گی میری عقل میں نکلے گی میں تو اِس کے پوشیدہ معارف سمجھنا چاہتا ہوں، میں اِس میں جتنا بھی گہرا جاؤں گا اُتنی ہی اچھی چیز ملے گی اور میں مایوس واپس نہیں آؤں گا تو وہ ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جب آپ قرآن شریف پر اعتراض کریں تو اللہ تعالیٰ پر توکّل ہو اور یہ خیال ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی مانگیں کہ یا اللہ! یہ اعتراض ہمارے لئے ٹھوکر کا موجب نہ ہو جائے۔ اِس کے ماتحت جب کبھی بھی میں نے غور کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے نئی باتیں سمجھائیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور علمِ غیب پر مشتمل ہے۔ پس اعتراض کے وقت آپ کو ڈرنا نہیں چاہئے کہ قرآن شریف پر اعتراض ہوگا تو کیا بنے گا۔ اگر آپ ڈریں گے تو یہ ایسی ہی جہالت ہوگی جیسی بچے بعض دفعہ

کر بیٹھتے ہیں۔

مجھے بھی اپنے بچپن کی ایک جہالت یاد ہے۔ جب میں چھوٹا بچہ تھا تو جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجلس میں بعض دشمن آتے اور آپ پر اعتراض کرتے تو چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نہایت سادگی سے بات کرتے تھے بعض دفعہ مجھے یہ وہم ہوتا تھا شاید آپ اُس شخص کی چالاکی کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے مگر جب دشمن مخالفت میں بڑھتا جاتا تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی آسمانی طاقت نے آپ پر قبضہ کر لیا ہے اور آپ اِس شان سے جواب دیتے کہ مجلس پر سناٹا چھا جاتا تھا۔ ایسی ہی بے وقوفی ان لوگوں کی ہے جو اس وقت کہ جب کوئی شخص قرآن شریف پر اعتراض کرے تو کہتے ہیں چپ ہو جاؤ ورنہ تمہارا ایمان ضائع ہو جائے گا حالانکہ یہ فضول بات ہے۔ چاہئے تو یہ کہ قرآن شریف پر جو اعتراض ہوں ان کے جوابات ایسے دیئے جاویں کہ دشمن بھی ان کی صداقت کو مان جائے نہ یہ کہ اعتراض کرنے والے کو اعتراض کرنے سے منع کر دیا جائے اور شکوک کو اُس کے دل میں ہی رہنے دیا جائے۔

مجھے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک بات خوب یاد ہے میں نے کئی دفعہ اپنے کانوں سے وہ بات آپ کے منہ سے سنی ہے۔ آپ فرمایا کرتے کہ اگر دنیا میں سارے ابوبکرؓ جیسے لوگ ہوتے تو اِتنے بڑے قرآن شریف کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف بِسْمِ اللّٰہِ کی ''ب'' کافی تھی۔ قرآن کریم کا اتنا پُر معارف کلام جو نازل ہوا ہے یہ ابوجہل کی وجہ سے ہے۔ اگر ابوجہل جیسے انسان نہ ہوتے تو اِتنے مفصّل قرآن شریف کی ضرورت نہ تھی۔ غرض قرآن کریم تو خدا تعالیٰ کا کلام ہے اس پر جتنے اعتراضات ہوں گے اتنی ہی اس کلام کی خوبیاں ظاہر ہوں گی۔ پس یہ ڈر کہ اعتراض مضبوط ہوگا تو اس کا جواب کس طرح دیا جائے گا ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ کیا خدا کے کلام نے ہمارے ایمان کی حفاظت کرنی ہے یا ہم نے خدا کے کلام کی حفاظت کرنی ہے؟ وہ کلام جس کو اپنے بچاؤ کے لئے انسان کی ضرورت ہے وہ جھوٹا کلام ہے اور چھوڑ دینے کے لائق، ہمارے کام کا نہیں۔ ہمارے کام کا وہی قرآن شریف ہے جس کی حفاظت کیلئے کسی انسان کی ضرورت نہ ہو بلکہ اس کا محافظ خدا ہو اور اس پر جو اعتراض ہو وہ خود اُس کو دور کرے اور اپنی عظمت آپ ظاہر کرے ہمارا قرآن کریم ایسا ہی ہے۔ ہاں ہمیں یہ

ضرور چاہئے کہ نہ اعتراض کو اس کی حقیقت سے چھوٹا کریں اور نہ ہی حقیقت سے باہر لے جا کر بڑا بنا دیں بلکہ ہمیں چاہئے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو موازنہ کی طاقت دی ہے اس سے کام لیں۔ اگر موازنہ میں غلطی کرو گے اور اعتراض کو اُس کی عقلی حدود سے بڑھا دو گے تو ضرور تمہارے دل پر زنگ لگ جائے گا اور اگر اعتراض کو بلا وجہ کم کر دو گے تو تمہارے دماغ کو زنگ لگ جائے گا۔ اور اگر بے دلیل اعتراض بناؤ گے تو تمہاری روحانیت کو زنگ لگ جائے گا۔ درمیان میں جو پُل صراط کا راستہ ہے اُس پر چل کر ہی تم کامیابی کا منہ دیکھ سکتے ہو اور قرآنی علوم کو حاصل کر سکتے ہو۔ آپ کو چاہئے کہ اِس نکتہ کو یاد رکھیں اور اِس پر عمل کر کے قرآن کریم کی تفسیر سیکھیں اور اس کے علوم حاصل کریں اور اس علم کو بڑھائیں۔ اگر آپ وہی باتیں بیان کریں گے جو آپ نے اپنے استاد سے سنی ہیں تو آپ کی مثال اُس زمین کی سی ہوگی جو پانی پی کر پانی اُگل دیتی ہے۔ لیکن اگر آپ اُن باتوں کو جو آپ نے اپنے اُستاد سے سنی ہیں ضرورت کے مطابق ایک نئی شکل دینے میں کامیاب ہوں گے تو آپ کی مثال اُس زمین کی سی ہوگی جو پانی پیتی ہے اور اس کے بعد سبزیاں نکالتی ہے۔

پس میں اِس نصیحت کے ساتھ اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ پر بھی اور دوسرے لوگ جو یہاں بیٹھے ہیں اُن پر بھی اپنے فضل نازل کرے قرآن شریف کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور یہ بھی توفیق عطا فرمائے کہ آپ اِس کو سمجھ کر ہر نئے اعتراض کے وقت ایک نئے علم کو دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ نادان کہتے ہیں کہ کسی نئی بات کی کیا ضرورت ہے اگر اِس کی ضرورت تھی تو کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس کا علم نہیں تھا کیا وہ اسے بیان نہیں کر سکتے تھے؟ نادان نہیں جانتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خدا کے کلام کا پانی لے کر آئے اور جس طرح زمین پانی پیتی ہے اور سبزیاں بنا کر اُسے اُگل دیتی ہے اِسی طرح خدا تعالیٰ کے کلام کے مفہوم کو نیک انسان ہمیشہ وقت کی ضرورت کے مطابق ایک نئی شکل میں پیش کرتے رہیں گے ہاں اس تعلیم کو کوئی شخص بدل نہیں سکتا۔ جس طرح پانی زمین میں جذب ہوتا ہے اور جذب ہو کر زمین میں سے سبزیاں نکالتا ہے اور اس سے پانی ہی کی عظمت ثابت ہوتی ہے اسی طرح قرآن کریم کے محل الفاظ کا انسانی دماغ میں داخل ہو کر اس

میں نئے علوم کا پیدا ہونا قرآن کریم ہی کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ لوگوں کو پڑھنے اور پڑھانے کی توفیق عطا فرماوے اور جماعت کے دوسرے دوستوں کو بھی توفیق عطا فرماوے کہ وہ قرآن شریف کے علوم حاصل کریں۔ اور ہماری جماعت میں قرآن شریف کو اس طرح قائم کر دیں کہ اِس کی جڑوں کو کوئی اُکھیڑ نہ سکے اور ہمارے بعد ہماری اولادوں کو بھی توفیق عطا فرماوے کہ قرآنی علوم حاصل کریں اور دنیا میں پھیلائیں اور اِس سلسلہ کو اِس قدر وسیع کرتے چلے جائیں جس طرح پُرانے زمانے میں فقیہہ بیٹھتے تھے۔ جیسے حضرت امام مالکؒ کے تو پانچ پانچ ہزار آدمی درس میں موجود ہوتے تھے اِسی طرح ہماری جماعت میں خدا تعالیٰ قرآن شریف پڑھنے اور پڑھانے والوں کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کر دے کہ معلّمین قرآن کا پڑھانا اور متعلّمین درسوں میں جانا ایک مصیبت اور چٹی نہ سمجھیں بلکہ پروانوں کی طرح وہاں جمع ہوں۔ اور اِسی طرح ہوتا چلا جائے یہاں تک کہ ہم اور ہماری اولادیں اور اُن کی اولادوں کی اولادیں ایک زمانہ دراز تک خدا تعالیٰ کی حکومت کے ماتحت اُس کے کلام کو سیکھتے اور سکھاتے ہوئے اِس طرح ہنستے ہوئے اور خوشی کے ساتھ اُچھلتے ہوئے چلتے چلے جائیں گویا ہماری زندگی کی لذت اِسی میں محصور ہے۔

(الفضل ۳ تا ۶ / اکتوبر ۱۹۴۵ء)

---

۱ الحدید: ۱۷

۲ لوقا باب ۱۵ آیت ۱۱ تا ۳۲

۳ بخاری کتاب العلم باب فضل من علم وعلم